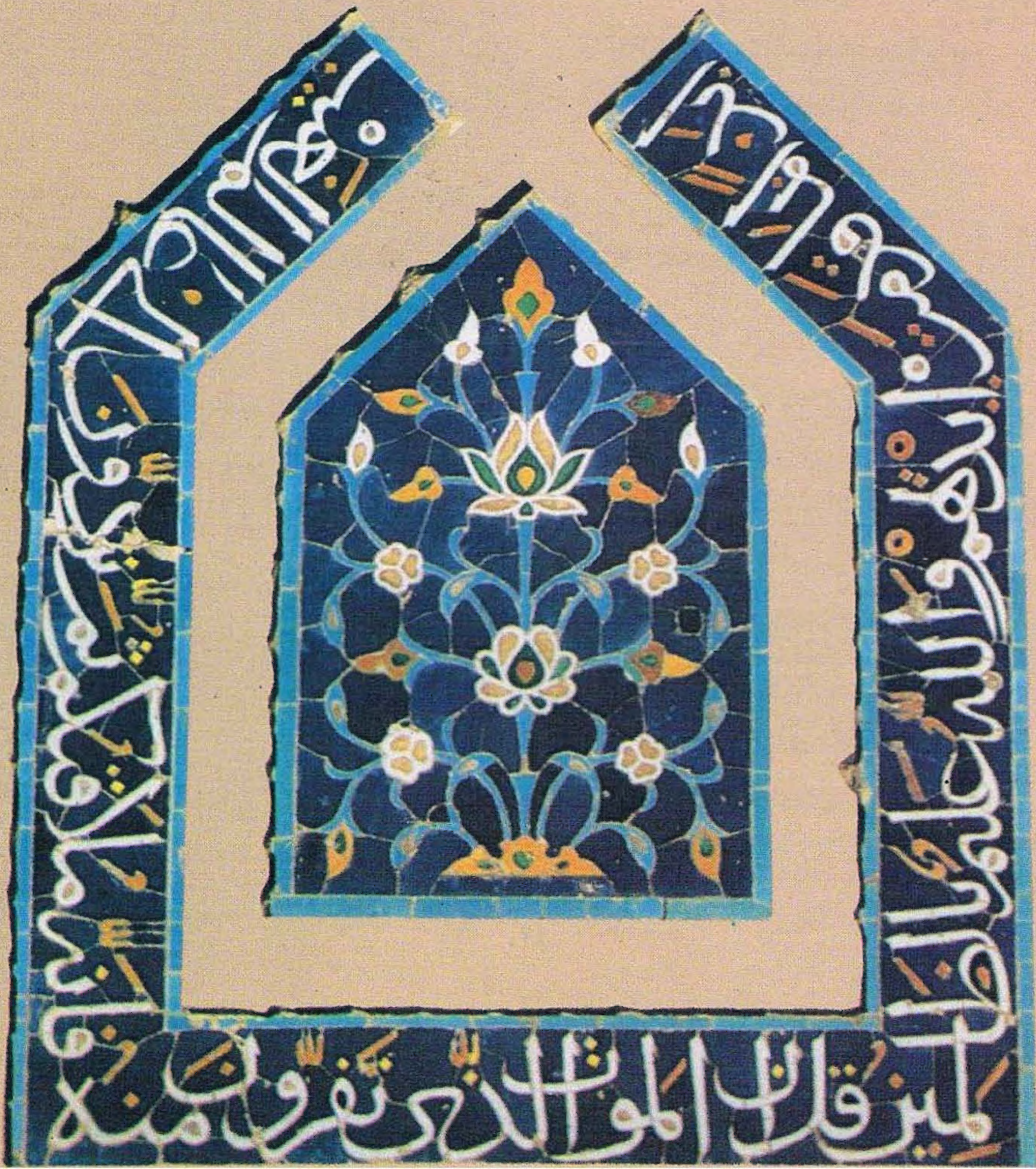
الرسالہ

Al-Risāla

September 1999 • No. 274 • Rs. 9

عجز جب اپنی آخری حد پر پہنچتا ہے تو
وہ طاقت بن جاتا ہے۔



عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر، مولانا وحیدالدین خاں کے قلم سے

تذکیر القرآن (مکمل)	400.00
اسلام: ایک تعارف	80.00
اللہ اکبر	45.00
پیغمبر انقلاب	50.00
مذہب اور جدید چیلنج	55.00
عظمت قرآن	35.00
عظمت اسلام	50.00
عظمت صحابہ	7.00
دین کامل	60.00
الاسلام	45.00
ظہور اسلام	50.00
اسلامی زندگی	40.00
احیاء اسلام	35.00
راز حیات	65.00
صراط مستقیم	40.00
خاتون اسلام	60.00
سوشلزم اور اسلام	50.00
اسلام اور عصر حاضر	30.00
الربانیہ	40.00
کاروانِ ملت	45.00
حقیقت حج	30.00
اسلامی تعلیمات	35.00
اسلام دور جدید کا خالق	25.00
حدیث رسول	40.00
سفر نامہ (غیر ملکی اسفار)	85.00
راہ عمل	25.00
تعبیر کی غلطی	80.00
دین کی سیاسی تعبیر	20.00
عظمت مومن	7.00
اسلام ایک عظیم جدوجہد	5.00
تاریخ دعوت حق	5.00

مطالعہ سیرت (کتابچہ)	12.00
ڈائری (جلد اول)	80.00
کتاب زندگی	65.00
اقوال حکمت	25.00
تعمیر کی طرف	8.00
تبلیغی تحریک	20.00
تجدید دین	25.00
عقلیات اسلام	35.00
قرآن کا مطلوب انسان	8.00
دین کیا ہے؟	7.00
اسلام دین فطرت	7.00
تعمیر ملت	7.00
تاریخ کا سبق	7.00
فسادات کا مسئلہ	5.00
انسان اپنے آپ کو پہچان	5.00
تعارف اسلام	5.00
اسلام پندرہویں صدی میں	5.00
راہیں بند نہیں	12.00
ایمانی طاقت	7.00
اتحاد ملت	7.00
سبق آموز واقعات	7.00
زلزلہ قیامت	10.00
حقیقت کی تلاش	8.00
پیغمبر اسلام	5.00
آخری سفر	7.00
اسلامی دعوت	7.00
حل یہاں ہے	10.00
سچا راستہ	8.00
دینی تعلیم	7.00
امہات المومنین	20.00
تصویر ملت	85.00

دعوت اسلام	50.00
دعوت حق	40.00
نشری تقریریں	80.00
دین انسانیت	60.00
فکر اسلامی	50.00
شتم رسول کا مسئلہ	50.00
طلاق اسلام میں	5.00
مضامین اسلام	60.00
حیات طیبہ	7.00
باغ جنت	7.00
نار جہنم	7.00
خلیج ڈائری	10.00
رہنمائے حیات	7.00
تعدد ازواج	7.00
ہندستانی مسلمان	50.00
روشن مستقبل	7.00
صوم رمضان	7.00
اسلام کا تعارف	4.00
علما اور دور جدید	8.00
سفر نامہ اسپین و فلسطین	60.00
مارکسزم: تاریخ جس کو رد کر چکی ہے	12.00
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	8.00
یکساں سول کوڈ	5.00
اسلام کیا ہے؟	8.00
میوات کا سفر	35.00
قیادت نامہ	35.00
مطالعہ سیرت	60.00
منزل کی طرف	4.00
اسباق تاریخ	85.00

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الرسالہ

Al-Risāla

اردو، اور انگریزی میں شائع ہونے والا

اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدین خاں

صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla

1, Nizamuddin West Market,
New Delhi-110013
Tel. 4625454, 4611128
Fax 4697333, 4647980
skhan@vsnl.com
http://www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES

Single copy Rs. 9
One year Rs. 100. Two years Rs. 195
Three years Rs. 290. Five years Rs. 480
Abroad: One year $ 10/£6 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY

IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577
e-mail: info@ipci-iv.co.uk

DISTRIBUTED IN USA BY

AL-RISALA FORUM INTERNATIONAL
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel./Fax 718-2583435
e-mail: Kaleem@alrisala.org

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi. Printed at Nice Printing Press, Delhi.

ستمبر 1999 شمارہ 274

خصوصی شمارہ: ہند۔ پاک ڈائری

(پہلی قسط)

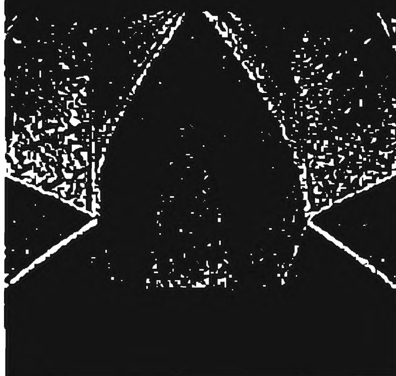
نئی کتابیں

اسفارِ ہند



مولانا وحید الدین خاں

قال اللہ وقال الرسول



01

میں ایک غیر سیاسی آدمی ہوں میری بیشتر زندگی تنہائی میں گزری ہے۔ تاہم تاریخی اعتبار سے میرا تعلق اس نسل سے ہے جس کو تقسیم (۱۹۴۷) سے پہلے کے ہندستان کو سن شعور میں دیکھنے کا موقع ملا۔ جس نے مولانا حسین احمد مدنی، پنڈت جواہر لال نہرو، سبھاش چندر بوس جیسے قومی رہنماؤں کی تقریریں اس وقت سنیں۔ جب کہ ہندستان کی آزادی ابھی بہت دور دکھائی دے رہی تھی۔ جس نے ۱۹۳۶ کے پہلے الکشن کو براہ راست دیکھا، جس نے ۱۹۴۷ سے پہلے بابری مسجد (ایودھیا) میں داخل ہو کر وہاں نماز پڑھی۔ جس نے اس ہندستان کو دیکھا جب کہ ریلوے اسٹیشنوں پر ہندو پانی اور مسلم پانی کے الگ الگ بورڈ ہوا کرتے تھے۔ اور اس ہندستان کو بھی جہاں اس قسم کے بورڈ ختم کر دیئے گئے ہیں۔ اس وقت کو بھی دیکھا جب کہ میرے وطن اعظم گڑھ میں صرف ایک موٹر کار تھی۔ اور آج کو بھی جب کہ اعظم گڑھ میں (اور اسی طرح ہر مقام پر) کثیر تعداد میں کاریں رات دن سڑکوں پر دوڑ رہی ہیں۔ خلاصہ یہ کہ جس نے "غلامی" کے زمانہ کو بھی دیکھا اور "آزادی" کے زمانہ کو بھی۔

براہ راست اور بالواسطہ مشاہدہ کی یہ مدت تقریباً سو سال کے دائرہ میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس طویل مدت میں میں نے جو کچھ دیکھا اور جو پڑھا اور جانا وہ ایک لمبی کہانی ہے جو انشاء اللہ میری سوانح عمری میں جگہ پا سکے گی۔ یہاں اس کے بعض اجزا درج کئے جاتے ہیں جو موجودہ حالات کو سمجھنے میں شاید رہنما بن سکیں۔

اس کا نام میں نے "ہندپاک ڈائری" رکھا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ تحریریں کسی تاریخی ترتیب پر مشتمل ہیں۔ یہ حقیقۃً مختلف تاثرات اور مشاہدات ہیں جو تاریخی ترتیب سے زیادہ ذوقی ترتیب پر مشتمل ہیں۔ ان تحریروں کو میں نے حوالوں سے بوجھل کرنا پسند نہیں کیا ہے بلکہ زیادہ تر تاثراتی انداز کو اختیار کیا ہے، اور میرا خیال ہے کہ دونوں ہی انداز کی اپنی الگ الگ افادیت ہے۔

اس مجموعہ کا مقصد یہ جاننے کی کوشش کرنا ہے کہ پچھلے سو سال کی ہنگامہ خیز جدوجہد کے

باوجود کیا وجہ ہے کہ ہماری تباہی کا خاتمہ نہ ہو سکا۔ اس معاملہ میں راقم الحروف کا جو نقطۂ نظر ہے اس کو واضح کرنے کے لئے یہاں ایک مثال درج کی جاتی ہے۔

۱۹۴۷ کے بعد پیش آنے والے واقعات میں شاید سب سے زیادہ ہنگامہ خیز واقعہ وہ ہے جو بابری مسجد (اجودھیا) سے تعلق رکھتا ہے۔ اس مسئلہ میں ہندو اور مسلمان دونوں گہرے طور پر شامل ہوئے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ مسئلہ اپنی ذات میں بہت زیادہ اہم ہے۔ اس کا اصل سبب یہ تھا کہ اس مسئلہ کو انتہائی غیر متناسب طور پر ابھارا گیا۔ اور اس ابھارنے میں ہندو اور مسلمان دونوں یکساں طور پر شریک تھے۔

ایک طرف ہندو رہنماؤں اور دانشوروں نے، ہندوؤں کو گری لال جین (وفات ۱۹۹۳) کی زبان میں یہ کہہ کر ابھارا کہ یہ تمہارے لئے دوسری شکست (second defeat) کا مسئلہ ہے۔ ۱۹۴۷ میں بٹوارہ کے سوال پر تم کو مسلمانوں کے مقابلہ میں شکست ہوئی، اب اجودھیا کے سوال پر ہمیں دوسری بار شکست کو قبول نہیں کرنا ہے۔

دوسری طرف مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والوں نے، خواہ وہ بے ریش ہوں یا باریش بیک زبان مسلمانوں سے یہ کہنا شروع کیا کہ یہ صرف ایک مسجد کا سوال نہیں ہے بلکہ وہ ملت مسلمہ کی بقا کا سوال ہے۔ بابری مسجد اس ملک میں ملت کی بقا کی علامت ہے۔ بابری مسجد اگر ڈھائی گئی تو اس ملک میں مسلمانوں کا پورا ملی وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔

یہ دونوں ہی باتیں سراسر بے بنیاد تھیں۔ بابری مسجد کا مسئلہ نہ تو ہندوؤں کے لئے دوسری شکست کا مسئلہ تھا، اور نہ مسلمانوں کے لئے ملت کی بقا کا مسئلہ۔ مگر اس قسم کی سنسنی خیز باتیں کہہ کر دونوں فرقوں کو اس طرح ابھارا گیا کہ دونوں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ یہ صف آرائی اتنی بڑھی کہ اجودھیا کا سوال دونوں فرقوں کے لئے وقار کا سوال بن گیا۔ جب کسی مسئلہ کو وقار کا مسئلہ بنا دیا جائے تو مسئلہ کے حل کے امکانات بڑھتے نہیں بلکہ خطرناک حد تک کم ہو جاتے ہیں۔ یہی مسجد مندر کے جھگڑے میں ہوا۔ جیسا کہ معلوم ہے ہندوستان میں تقسیم کے وقت سرحدی علاقوں میں ہزاروں مسجدیں ڈھائی گئیں خود مسلم دنیا میں بھی تقریباً ہر

مسلم ملک میں کثرت سے مسجدیں ڈھائی گئی ہیں۔ مگران مسجدوں میں سے کسی مسجد کاڈھایا جانا کسی خطرناک صورت حال کا سبب نہیں بنا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان مسجدوں کے نام پر مسجد والوں اور ڈھانے والوں کے درمیان ایسی تحریکیں نہیں چلائی گئیں جو اس معاملہ کو دونوں فریق کے لئے وقار کا مسئلہ بنادیں۔

بابری مسجد کو جس چیز نے ایک خطرناک مسئلہ بنایا وہ خود بابری مسجد کی انفرادی نوعیت نہیں تھی۔ بلکہ بابری مسجد کے نام پر چلائی جانے والی تحریک کی انفرادی نوعیت تھی۔ اس انداز کی جذباتی تحریک جس مسجد یا غیر مسجد کے لئے بھی چلائی جائے، وہ یقیناً اسی قسم کا منفی نتیجہ پیدا کرے گی۔

۱۹۱۳ میں اس وقت کی انگریز حکومت نے کانپور کی ایک مسجد کے صرف غسل خانہ کو سڑک کی توسیع کے لئے ڈھایا تھا۔ اس کے نام پر اس زمانہ کے لیڈروں نے زبردست تحریک اٹھادی۔ اس کے پیچھے مسجد کی حمایت سے زیادہ انگریز کی مخالفت کا جذبہ تھا۔ اس زمانہ کے مسلم لیڈروں کی جذباتی تقریروں نے مسلمانوں کو اس قدر بھڑکایا کہ وہ انگریز انتظامیہ سے لڑ گئے۔ اس کے بعد انگریزی پولیس نے گولی چلائی جس میں بہت سے مسلمان ہلاک ہو گئے۔ مولانا شبلی نعمانی نے اس واقعہ پر ایک جذباتی نظم لکھی جو اس زمانہ میں بہت مقبول ہوئی۔ اس نظم میں لاشوں کے منظر کی تصویر کشی کرتے ہوئے آخر میں یہ کہا گیا تھا کہ :

پوچھا جو میں نے کون ہو تم آئی یہ صدا ہم کشتگانِ معرکہٗ کانپور ہیں

یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ اکثر عرب ملکوں میں سڑک کی توسیع کے لئے نہ صرف غسل خانہ بلکہ پوری کی پوری مسجدیں ڈھادی گئیں۔ مگر وہاں مسلمانوں کی لاشوں کا یہ دردناک منظر کبھی دکھائی نہیں دیا۔ اس کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ وہاں اس قسم کے جذباتی لیڈر موجود نہ تھے جو مسلمانوں کو اشتعال دلا کر ان کو انتظامیہ سے ٹکرائیں۔ اس کے نتیجہ میں پولیس گولی چلائے اور مسلمانوں کی خونی لاشیں زمیں پر دکھائی دینے لگیں۔

02

آج بر صغیر ہند میں ہر سوچنے والے انسان کے سامنے ایک ہی سوال ہے۔ وہ یہ کہ پچھلے تقریباً سو سال کے درمیان یہاں بہت سی بڑی بڑی تحریکیں چلائی گئیں اور بے شمار قربانیاں دی گئیں مگر نتیجہ صفر رہا۔

ہماری تمام کوششیں اور قربانیاں عملاً رائیگاں ہو کر رہ گئیں۔ کچھ نئی چیزوں کا حوالہ دے کر کہا جاتا ہے کہ آزادی کے بعد انڈیا نے یہ اور یہ ترقیاں کی ہیں۔ مگر یہ حوالے درست نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ تمام جدید چیزیں زمانہ کی پیداوار ہیں۔ وہ صنعتی انفجار (industrial explosion) کا نتیجہ ہیں۔ وہ سیاسی آزادی یا ملکی حکومت کی دین نہیں۔ ہندستان میں اگر انگریزوں کی حکومت باقی رہتی تب بھی یہ نئی ترقیاں ہمیں اسی طرح حاصل ہوتیں جیسے کہ وہ آج حاصل ہیں۔ اس کی ایک مثال ملک میں جدید کمیونی کیشن (مثلاً ریلوے) کا نظام ہے جو زیادہ تر انگریزوں ہی کے زمانے میں قائم ہوا۔

اس المیہ کا سبب اصلاً صرف ایک ہے۔ پختگی کی عمر کو پہنچنے کے بعد میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ بر صغیر ہند میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جو لیڈر اٹھے وہ تقریباً سب کے سب ایک ہی غلطی کا شکار ہوئے۔ اس غلطی نے ان کی ہمالیائی کوششوں کو بے نتیجہ بنادیا۔ یہ ترجیحات (priorities) کا غلط تعین ہے۔

۱۹۴۷ سے پہلے کے ہندستان میں مہاتما گاندھی نے سیاسی آزادی کو اپنی پہلی ترجیح بنایا۔ حالانکہ زیادہ صحیح یہ تھا کہ وہ تعلیم کو اپنی پہلی ترجیح بنائیں۔ آزادی کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو نے سوسلشٹ اکانومی (زیادہ صحیح لفظوں میں سرکاری اکانومی) قائم کرنے کو اپنی پہلی ترجیح بنایا۔ حالانکہ ان کے لئے صحیح یہ تھا کہ وہ ملک میں انفراسٹکچر (infrastructure) وجود میں لانے کو اپنی پہلی ترجیح بنائیں۔ اٹل بہاری باجپئی نے ایٹم بم بنانے کو اپنی پہلی ترجیح قرار دیا۔ حالانکہ ان کے لئے صحیح یہ تھا کہ وہ سرکاری بھرشٹاچار ختم کرنے کو اپنی پہلی ترجیح بنائیں۔

یہی معاملہ سرحد کے دوسری طرف پاکستان میں ہوا۔ مسٹر محمد علی جناح نے دو قومی دنیا

وجود میں لانے کو اپنی اولین ترجیح بنایا۔ حالانکہ ان کے لئے صحیح یہ تھا کہ وہ ایک قومی دنیا وجود میں لانے کو اپنی اولین ترجیح بنائیں۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اسلامائزیشن آف اسٹیٹ کو اپنی پہلی ترجیح بنایا۔ حالانکہ ان کے لئے صحیح یہ تھا کہ وہ اسلامائزیشن آف مین کو اپنی پہلی ترجیح بنائیں۔ محمد نواز شریف کو چاہئے تھا کہ وہ اقتصادی خود کفالتی کو پاکستان کی پہلی ترجیح بنائیں جو کہ تقریباً پچاس بلین ڈالر کا مقروض ہو چکا ہے۔ مگر انھوں نے شاہین بم اور غوری مزائل بنانے کو اپنی پہلی ترجیح قرار دیا۔ وغیرہ۔

صحیح ترجیح اختیار کرنیوالی قوم وقت پر اپنی منزل پر پہنچتی ہے۔ اور غلط ترجیح اختیار کرنے والی قوم کہیں بھی نہیں پہنچتی خواہ بظاہر وہ کتنی ہی زیادہ لمبی مدت تک سرگرمی دکھاتی رہے۔ بدقسمتی سے یہی دوسری صورت انڈیا اور پاکستان کے حصہ میں آئی ہے۔

03

آزادی سے پہلے غالباً ۱۹۴۴ میں میں لاہور گیا تھا۔ اس وقت شاہ گنج (جون پور) سے لاہور تک براہ راست ٹرین جاتی تھی۔ چنانچہ میں اپنے قریبی اسٹیشن شاہ گنج میں ٹرین پر بیٹھا اور سفر کر کے لاہور اسٹیشن پر اتر گیا۔ اس وقت وہاں میرا کوئی جاننے والا نہ تھا۔ پہلی رات میں نے ریلوے اسٹیشن سے قریب ایک مسجد میں گذاری۔ اس کے بعد دن کو میں شہر دیکھنے کے لئے نکلا۔

میں بغیر کسی منصوبہ کے لاہور کی سڑکوں پر چل رہا تھا۔ اتفاقی طور پر ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ان کا پورا نام مجھے یاد نہیں۔ البتہ یہ یاد ہے کہ لوگ انہیں قریشی صاحب کہا کرتے تھے۔ وہ مجھ پر مہربان ہو گئے اور مجھے اپنے گھر لے گئے جو صرف ایک کمرہ پر مشتمل تھا۔ میں تقریباً دو ہفتہ ان کے ساتھ رہا۔ انھوں نے مجھ کو جن لوگوں سے ملایا ان میں سے ایک لاہور کے ہندو تاجر تھے۔ لاہور کے مال روڈ پر ان کی ایک بڑی دوکان تھی جس کے اوپر جلی حرفوں میں انگریزی میں لکھا ہوا تھا: بی لیلارام اینڈ سنز۔ قریشی صاحب کے اس ہندو تاجر سے بہت اچھے تعلقات تھے وہ کئی بار مجھ کو وہاں لے گئے۔ اس ہندو تاجر نے میرے ساتھ نہایت عزت اور محبت کا معاملہ کیا۔ اس وقت لاہور میں بہت سے ہندو رہتے تھے۔ ان ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اس وقت

نہایت خوشگوار تعلقات تھے۔ یہی حال اس پورے خطہ کا تھا جس کو اب پاکستان کہا جاتا ہے۔

یہ آزادی سے پہلے کی بات ہے۔ اب آزادی کے بعد اسی خطۂ ارضی میں کیا حالات ہیں۔ اس کا ایک نمونہ یہ ہے کہ یکم جون ۱۹۹۸ کو میں نے ریڈیو پاکستان پر پاکستانی وزیر اعظم مسٹر محمد نواز شریف کی تقریر سنی۔ وہ پاکستانی عوام کو خطاب کرتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ جس دن (۲۸ مئی ۱۹۹۸) ہم اپنا ایٹمی دھماکہ کرنے والے تھے، اس سے پہلے کی رات کو میں بالکل نہیں سویا۔ اس لئے کہ ہر وقت یہ اندیشہ تھا کہ دشمن کہیں ہمارے اوپر حملہ نہ کردے۔

آزادی سے پہلے جب میں نے مذکورہ سفر کیا تو اتر پردیس سے لے کر پنجاب تک ہر جگہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان برادرانہ ماحول کا منظر تھا۔ اس وقت دونوں میں سے کوئی بھی "دشمن" کا لفظ نہیں بولتا تھا۔ مگر آج سرحد کے دونوں طرف اس لفظ کا استعمال عام ہو چکا ہے۔ اس فرق کا سبب کیا ہے۔ اس فرق کا اصل سبب میرے علم کے مطابق زرد صحافت اور زرد قیادت ہے۔ جس نے مصنوعی طور پر دوستی کو دشمنی میں بدل دیا ہے۔

زرد صحافت اور زرد قیادت کا طریقہ کیا ہے۔ یہ طریقہ ایک لفظ میں منتخب رپورٹنگ (selective reporting) یعنی ایک ہزار میں سے ۹۹۹ اچھی باتوں کو چھوڑ دینا، اور صرف ایک بری بات کو مزید اضافہ کے ساتھ کثرت سے بیان کرنا۔ یہی پچھلے برسوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے ساتھ پیش آیا ہے۔ دونوں طرف کے کچھ لکھنے اور بولنے والے اسی اسلوب کو اختیار کرکے دونوں گروہوں کو غیر فطری طور پر بھڑکاتے رہے۔ یہاں تک کہ دونوں کے درمیان فطرت کا قائم کردہ معتدل تعلق ٹوٹ گیا اور دونوں کے درمیان غیر معتدل تعلق قائم ہو گیا۔ زرد صحافت اور زرد قیادت کے معاملہ کو سمجھنے کے لئے دونوں طرف کی ایک ایک مثال یہاں درج کی جاتی ہے۔

میرے علم کے مطابق، پچھلے تقریباً ۶۰ سال سے ایک بات مسلمانوں کے درمیان بار بار دہرائی جاتی رہی ہے۔ وہ یہ کہ ہندوؤں کا یہ منصوبہ ہے کہ آزادی کے بعد جب اکثریتی فرقہ ہونے کی حیثیت سے انھیں ملک میں اقتدار حاصل ہو تو وہ ہندستان کو دوسرا اسپین بنانے کی کوشش

کریں۔ یعنی اس ملک سے مسلمانوں کا خاتمہ کردیں۔ یہ بات جمعیۃ علماء ہند کے مولانا محمد میاں (۱۹۰۳-۱۹۷۵) سے لے کر ندوۃ العلماء کے مولانا علی میاں تک، لمبے عرصہ سے بار بار دہراتے رہے ہیں۔ مگر ان حضرات میں سے کسی نے کبھی اس کا کوئی ماخذ نہیں بتایا۔ یہ صرف ایک سنی سنائی بات ہے جس کو ہمارے علماء اور غیر علماء بلا تحقیق برابر دہراتے رہتے ہیں۔ اس نے مسلمانوں کے اندر برادران وطن کی طرف سے ایک غیر ضروری قسم کا خوف پیدا کر دیا۔ ان کے اندر وہ معتدل مزاج باقی نہ رہا جو کسی ملک میں مستحکم ترقی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے۔

"دوسرے اسپین" کا افسانہ ہر اعتبار سے بے بنیاد ہے۔ نہ اس کا کوئی واقعی ثبوت موجود ہے کہ ہندوؤں کی کوئی تنظیم اس مقصد کے لئے کام کر رہی ہے۔ اور اگر بالفرض ایسے کچھ سر پھرے ہندو ماضی میں رہے ہوں یا آج کہیں موجود ہوں تب بھی اس قسم کا تخریبی منصوبہ بلاشبہ خدا کی اس دنیا میں ناقابل عمل ہے۔ ایسی حالت میں ہمارا کام اس کو نظر انداز کرنا ہے نہ کہ اس کو ایک خطرہ بتا کر مسلمانوں کو اس سے ڈرانا (اس کی تفصیل راقم الحروف کی کتاب ہندستانی مسلمان کے باب "بے بنیاد خوف" میں دیکھی جاسکتی ہے)

زرد صحافت اور زرد قیادت کا یہی معاملہ خود ہندوؤں کے درمیان بھی پیش آیا۔ لکھنے اور بولنے والے ہندوؤں کے ایک طبقہ نے عجیب وغریب طور پر ہندوؤں میں یہ افواہ پھیلائی کہ مسلمانوں کے لئے اپنے مذہب کے رو سے چار شادیاں کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ ہر مسلمان چار شادیاں کرتا ہے، جب کہ ہندو صرف ایک شادی کرتا ہے۔ اس طرح ایک مسلمان ایک ہندو کے مقابلہ میں چوگنا زیادہ بچے پیدا کر رہا ہے۔ گویا کہ ہندوؤں کی آبادی ۱۔۲۔۳۔۴ کی رفتار سے بڑھ رہی ہے۔ جب کہ مسلمانوں کی آبادی ۱۔۲۔۴۔۸۔۱۶ کی رفتار سے بڑھ رہی ہے۔ اس طرح مسلمان بہت جلد تعداد میں ہندوؤں سے زیادہ ہو جائیں گے۔

ایسی حالت میں ضروری ہے کہ مسلمانوں کے اضافۂ آبادی کو روکنے کیلئے سخت تدبیر اختیار کی جائے۔ بھارتیہ جنتا پارٹی جیسی انتہا پسند جماعت کو سیاسی اقتدار تک پہنچانے میں اس قسم کے فرضی خطرہ کا بہت بڑا دخل ہے۔ ہندوؤں کو محسوس ہوا کہ کانگریس جیسی "نرم" پارٹی مسلم

نسل کی حد بندی نہیں کر سکتی۔ اس لئے ضروری ہے کہ ایک "سخت" پارٹی کو مرکزی اقتدار دیا جائے، ورنہ ہندو پچاس برس بعد خود اپنے ہی ملک میں اقلیت بن کر رہ جائیں گے۔

اس بے بنیاد افواہ کی مدلل تردید میں نے اپنے مضامین میں کی ہے۔ اس کے علاوہ خود ہندوؤں کے جلسہ میں بھی ایک سے زیادہ بار اس کی تردید کر چکا ہوں (ملاحظہ ہو راقم الحروف کی کتاب یکساں سول کوڈ) ۳ر فروری ۱۹۹۷ کو نئی دہلی کے کانسٹی ٹیوشن کلب میں ایک جلسہ تھا۔ اس میں دہلی کے آر ایس ایس گروپ کے لوگ بڑی تعداد میں شریک تھے۔ یہاں مجھے تقریر کرنے کا موقع ملا۔ میں نے جو باتیں کہیں ان میں چار شادی کا یہ افسانہ بھی تھا۔

میں نے کہا کہ قرآن وحدیث میں کہیں بھی یہ حکم نہیں ہے کہ ہر مسلمان چار شادی کرے۔ تاہم اس سے قطع نظر عقل عام ہی یہ سمجھنے کے لئے کافی ہے کہ ایسا ہونا عملی طور پر ممکن نہیں۔ یہ بات اتنی زیادہ بے بنیاد ہے کہ وہ بظاہر ہی قابل رد ہے:

Prima facie it stands rejected.

میں نے کہا کہ بالفرض اگر ہر مسلمان چار شادیاں کرے تو یہ صرف اس وقت ممکن ہوگا جب کہ مسلم سماج میں عورتوں کی تعداد مردوں کے مقابلہ میں چار گنا زیادہ ہو۔ یعنی اگر ایک کرور مرد ہوں تو چار کرور عورتیں۔ مگر واقعات بتاتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے۔ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ نیچر ہمیشہ عورت اور مرد کی تعداد کے درمیان ایک توازن (equilibrium) برقرار رکھتی ہے۔ چنانچہ ہر سماج میں عورت اور مرد کی تعداد ہمیشہ تقریباً یکساں رہتی ہے۔ حتی کہ اگر جنگ یا کسی بڑے حادثہ کی وجہ سے وقتی طور پر یہ توازن ٹوٹ جائے تو نیچر بہت جلد اس کے مطابق افراد پیدا کر کے اس توازن کو دوبارہ قائم کر دیتی ہے۔

یہی تمام انسانی معاشروں کا حال ہے۔ اور یہی مسلم معاشرے کا حال بھی۔ ایسی حالت میں یہ بات سرے سے ممکن ہی نہیں کہ ہر مسلمان چار عورتوں سے شادیاں کرے۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی تھی کہ مسلمانوں کے پاس کوئی عورت ساز فیکٹری ہو جس میں وہ اپنی مطلوب تعداد کے مطابق عورتیں بنالیا کرتے ہوں۔ مگر اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں کہ مسلمانوں کے پاس ایسی کوئی

عورت ساز فیکٹری موجود ہے۔

پھر ہر مسلمان اگر چار شادی کرے گا تو کس طرح کرے گا۔ یہ فاضل عورتیں آخر کہاں سے لائی جائیں گی۔

اس قسم کی افواہی باتیں جو ہندو اور مسلمان دونوں کے درمیان پھیلائی گئیں۔ انھوں نے اس فطری تعلق کو توڑ دیا جو دونوں کے درمیان سیکڑوں سال سے قائم تھا۔ اس کا ایک نتیجہ ملک کے بٹوارہ کی صورت میں ظاہر ہوا۔ تاہم بٹوارہ کے بعد اگر افواہوں کا یہ کارخانہ بند ہو جاتا تب بھی اس میں کوئی حرج نہیں تھا۔ ایک عارضی وقفہ کے بعد دوبارہ فطرت اپنے آپ مطلوب اعتدال کو دونوں کے درمیان قائم کر دیتی۔ مگر بدقسمتی سے ایسا نہ ہو سکا بلکہ افواہوں کا یہ کارخانہ مزید اضافہ کے ساتھ جاری رہا۔ یہاں تک کہ اب سرحد کے دونوں طرف اس بات پر فخر کیا جا رہا ہے کہ ہم اب ایٹمی طاقت بن چکے ہیں۔ اب ہم دشمن کو اس طرح مٹا سکتے ہیں کہ اس کا کوئی وجود ہی زمین پر باقی نہ رہے۔

04

یوپی کے ضلع اعظم گڑھ میں میرے گاؤں سے تقریباً ۳ کیلو میٹر کے فاصلہ پر بستین پور تھا۔ یہاں ایک وسیع زرعی فارم کے اندر یورپی طرز کی ایک لال عمارت تھی جس کو "صاحب کا بنگلہ" کہا جاتا تھا۔ یہاں ایک انگریز مسٹر لاری رہا کرتا تھا جو غالباً پہلی عالمی جنگ کے بعد یہاں آکر آباد ہوا تھا۔ ۱۹۴۷ کے انقلاب کے بعد وہ اپنے وطن انگلینڈ واپس چلا گیا۔ انگریزی حکومت نے یہاں اس کو ایک بڑی زمین دی تھی۔ وہ یہاں رہتا تھا اور زمین پر کاشت کرتا تھا۔ وہاں سے گزرتے ہوئے میں نے کئی بار اس بنگلہ کو دیکھا تھا۔ اب نئے مالکوں نے اس کو توڑ کر وہاں کھیت بنادیا ہے۔

اس وقت یہاں سڑک نہیں تھی۔ مسٹر لاری گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے بنگلہ سے ریلوے اسٹیشن پھریہا جایا کرتا تھا۔ یہ ریلوے لائن اس علاقہ میں ۱۹۰۱ میں بچھائی گئی۔ اس کا یہ راستہ ہمارے گھر کے سامنے سے گزرتا تھا۔ ہمارے گھر والے اس وقت علاقہ کے بڑے زمیندار تھے اور

اسی کے ساتھ آزادی کی تحریک سے متاثر تھے۔ چنانچہ یہ بات ان کو اپنے وقار کے خلاف معلوم ہوئی کہ ایک انگریز گھوڑے پر سوار ہو کر ان کے گھر کے سامنے سے گزرے۔ ہمارے گھر والوں نے اس کو منع کیا۔ جب وہ نہیں مانا تو ایک روز اس کے گھوڑے کو روک کر اس کی پٹائی کی۔ تاہم اس نے کوئی انتقامی کارروائی نہیں کی۔ اس نے صرف یہ کیا کہ آئندہ کے لئے اس نے اپنا اسٹیشن کا راستہ بدل دیا۔ اب وہ نظام آباد کے راستہ سے ریلوے اسٹیشن جانے لگا۔ اگرچہ یہ اس کے لئے ایک لمبا راستہ تھا۔

نوجوانی کی عمر میں میں اس پر فخر کرتا تھا کہ میرے خاندان والوں نے مسٹر لاری کو گھوڑے سے اتار کر مارا۔ مگر اب میں سوچتا ہوں کہ یہ بات نہ صرف غیر انسانی تھی بلکہ غیر دانشمدانہ بھی تھی۔

مسٹر لاری ایک ترقی یافتہ قوم کا فرد تھا۔ اس کے مکان کا طرز تعمیر، اس کی زراعت کا اصول، اس کے رہن سہن کا انداز، حتی کہ اس کے رد عمل کا طریقہ، ہر چیز میں لوگوں کیلئے نئی باتیں تھیں۔ جس سے بہت کچھ سیکھا جا سکتا تھا۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ اس پورے علاقہ میں اس وقت غالباً وہ واحد شخص تھا جو انگریزی داں تھا۔ ہمارے خاندان کے لوگوں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ اس انگریز سے انگریزی زبان سیکھی جائے جو زمانہ کے لحاظ سے گویا ترقیاتی دور میں داخلہ کا دروازہ تھا۔

اس کا سبب کیا تھا۔ اس کا سبب انگریزوں کے خلاف وہ نفرت تھی جو اس زمانہ کے ہندو اور مسلم دونوں لیڈروں نے پورے ملک میں پھیلا رکھی تھی۔ اس زمانہ کے ہندو اور مسلمان دونوں کے لئے انگریز کا لفظ صرف نفرت کی ایک علامت بنا ہوا تھا۔ اس نفرت کے جذبہ کو تیز کرنے کے لئے اس زمانہ کے لیڈر نئی نئی تحریکیں چلاتے رہتے تھے۔ مثال کے طور پر انگلینڈ کے کپڑوں کو جلانا۔ چنانچہ اس زمانہ میں انگلینڈ کے کپڑے خود ہمارے گاؤں میں بھی گھروں سے لے کر جلائے گئے۔ بد قسمتی سے بر صغیر ہند میں پچھلے سو سال کے اندر جتنی بڑی بڑی تحریکیں چلائی گئیں وہ تقریباً سب کی سب مبنی بر نفرت تحریکیں تھیں۔ شاید ان میں سے کوئی بھی مبنی بر محبت تحریک نہ

تھی۔ نفرت انسان کا سب سے زیادہ طاقتور جذبہ ہے۔ نفرت کے جذبات کو بھڑکا کر بہت تھوڑی مدت میں بہت بڑی بڑی تحریکیں چلائی جاسکتی ہیں۔ مگر اس قسم کی تحریکیں انسانیت کو تباہی کے سوا اور کچھ نہیں دیتیں۔ نفرت کی بنیاد پر اٹھائی ہوئی تحریک میں لوگ انگریز سے بھی نفرت کرنے لگتے ہیں اور انگریزی سے بھی۔

اس کے برعکس اگر محبت کی بنیاد پر تحریک اٹھائی جائے تو لوگ ایک کو دوسرے سے الگ کر کے دیکھیں گے۔ وہ انگریز کو سیاسی اعتبار سے غیر مطلوب سمجھتے ہوئے بھی ان سے انگریزی زبان سیکھیں گے اور انگریزی علوم کو حاصل کریں گے۔ مگر بد قسمتی سے برصغیر ہند میں محبت پر مبنی کوئی بڑی تحریک اٹھائی نہیں جاسکی۔ یہی وجہ ہے کہ ہنگامہ خیز تحریکوں کے باوجود ہمارے ملک میں کوئی حقیقی تعمیری کام نہ ہو سکا۔

05

میں ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوا جس کو آجکل کی اصطلاح میں فریڈم فائٹر کہا جاتا ہے۔ میرے گھر میں رات دن آزادی کا چرچا رہتا تھا۔ ہمارے خاندان کے سرپرست مولانا اقبال احمد سہیل (وفات ۱۹۵۵ء) کٹر کانگریسی تھے۔ ۱۹۴۲ میں میری شادی ہوئی تو انھوں نے سر سے پاؤں تک مجھے کھدر کے کپڑے پہنائے تھے۔ گاندھی اور نہرو نیز حب الوطنی کے بارے میں ان کے تین شعر یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

آنند بھون سے کیا غرض اب   ہر دل ہے نشیمنِ جواہر
غلط ہے یہ کہ فقط ہندوؤں کا لیڈر تھا   کہ تھا تمام جہاں بھر کا رہنما گاندھی
محبت ہے وطن کی گل زمیں سے   ہمیں اب کیا غرض خلد بریں سے

اس زمانہ کے دوسرے بہت سے نوجوانوں کی طرح میں بھی آزادی کے سنہرے خواب دیکھا کرتا تھا۔ لوگوں کی باتیں سن کر آزاد ہندستان کا عجیب و غریب طلسماتی تصور میرے ذہن میں بسا ہوا تھا۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو جب ہندستان آزاد ہوا، اس وقت میں یوپی کے شہر اعظم گڈھ میں تھا۔ رات کو میں اپنے گھر سے نکل کر شہر کے چوک کی طرف روانہ ہوا۔ چاروں طرف ایک

عجیب رومانی ماحول تھا۔ ۱۵ اگست کی اس رات کو جب میں اعظم گڈھ کی سڑک پر چل رہا تھا تو مجھے وہ انوکھا تجربہ ہوا جس کو اب تک میں نے صرف افسانوں میں پڑھا تھا...... خوشی سے میرے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔

اس رات کو میں نے دیکھا کہ پورا شہر (اور اسی طرح پورا ملک) چراغوں کی روشنی سے جگمگا رہا ہے۔ مگر جب صبح ہوئی تو یہ تمام چراغ بجھ چکے تھے اور اس کے بعد وہ پھر کبھی نہیں جلائے گئے۔ اب ۱۵ اگست صرف ایک سرکاری تہوار ہے نہ کہ حقیقی معنوں میں کوئی قومی تہوار۔ کیوں کہ قوم نے سیاسی آزادی سے جو امیدیں وابستہ کی تھیں وہ پوری نہ ہو سکیں۔

یہ احساس صرف میرا احساس نہیں۔ بلکہ یہی ملک کے تمام لوگوں کا احساس ہے۔ اس سے مستثنیٰ صرف وہ تھوڑے سے لوگ ہو سکتے ہیں جنھیں اتفاق سے یہ موقع ملا کہ وہ ملک کی دولت کو لوٹ کر اپنے گھروں اور بینکوں میں بھر لیں۔ جن کا مسئلہ بقول ایک شخص، انکم نہیں ہے بلکہ انکم ٹیکس ہے۔

نوجوانی کی عمر میں میں آزادی کے مسرت بھرے انتظار میں جی رہا تھا۔ اب جب کہ میری عمر ہجری کلینڈر کے اعتبار سے ۸۰ سال کے قریب پہنچ رہی ہے، میں اس انتظار میں اپنی زندگی کے آخری لمحات گذار رہا ہوں کہ اپنی موت سے پہلے وہ دن دیکھ لوں جب کہ میرا ملک ترقی کی اس منزل میں اپنا قدم رکھ چکا ہو۔ جس کا خواب ۱۹۴۷ سے پہلے ہمارے رہنماؤں نے دیکھا تھا۔

06

مجھے باہر کے کئی ملکوں میں نہایت قیمتی مواقع ملے جہاں جا کر میں ایک مطمئن زندگی گذار سکتا تھا۔ مگر میرے دل میں کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال نہیں آیا کہ میں اپنے وطن کو چھوڑ کر کسی اور ملک میں چلا جاؤں اور وہاں آسائش کی زندگی گذاروں۔ اپنا مادر وطن مجھے اسی طرح عزیز ہے جس طرح مجھے اپنی ماں عزیز ہے۔

اپریل ۱۹۸۳ میں جب پہلی بار میں امریکہ گیا تو کسی غلط اطلاع کی بنا پر مجھے نیویارک ائیرپورٹ پر ہی پولیس کی حراست میں لے لیا گیا۔ ایک پولیس افسر جس نے اپنا نام مسٹر لوئی

(LOUIS) بتایا تھا، وہ مجھ کو اپنی گاڑی میں بیٹھا کر ائیر پورٹ سے پولس اسٹیشن لے گیا۔ اور جب واپسی کے جہاز کا وقت ہوا تو دوبارہ مجھے ائیر پورٹ پر لا کر جہاز کے اندر بٹھادیا۔ اس نے میرا پاسپورٹ اور میرا ٹکٹ بھی مجھ کو نہیں دیا صرف یہ کہا کہ دوران پرواز وہ مجھ کو پائلٹ کے ذریعہ مل جائے گا۔ مسٹر لوئی جس وقت مجھ کو نیویارک ائیر پورٹ سے پولیس آفس کی طرف لے جارہے تھے۔، میں نے ان سے کہا کہ مسٹر لوئی، آپ کو شاید یہ اندیشہ ہے کہ میں امریکہ میں رہ جاؤں گا۔ مگر میں ایک اور ڈھنگ کا آدمی ہوں، اگر آپ مجھے امریکہ کا صدر بنادیں تب بھی میں یہاں رہنے والا نہیں ہوں۔ مجھے اپنے وطن جانا ہے۔ اور وہاں اپنے اس تعمیری مشن کو پورا کرنا ہے جس کے لئے میں نے اپنی ساری زندگی وقف کرر کھی ہے۔

۱۹۷۱ کے نصف اول میں میں نے بذریعہ ٹرین پاکستان کا سفر کیا جب میں بارڈر کے دوسری طرف پہنچا تو میرے قلی نے کہا کہ آپ کو وہ میجر صاحب بلارہے ہیں۔ اس کے بعد قلی نے مجھے ایک فوجی خیمے کے اندر پہنچادیا۔ وہاں ایک پاکستانی فوجی افسر بیٹھا ہوا تھا۔ اس خیمے میں صرف ہم دو آدمی تھے یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ بنگلہ دیش کی جنگ کی تیاریاں ہورہی تھیں۔ باوردی فوجی افسر نے مجھ سے کہا کہ انڈیا کے کچھ فوجی راز بتایئے۔ یہ سنتے ہی مجھے غصہ آگیا۔

میں نے کہا میجر صاحب، آپ مجھ سے یہ سمجھ کر بات کیجئے کہ میں انڈیا کا ایک وفادار شہری ہوں (یہ بات میں نے پاکستان کی سرزمین پر ایک فوجی خیمے میں اس وقت کہی جب کہ اگر وہ فوجی افسر مجھے گولی ماردیتا تو شاید میری موت اس طرح واقع ہوجاتی کہ اس کی کوئی خبر بھی نہ بنتی)

پھر میں نے کہا کہ اگر انڈیا کے ساتھ آپ کی لڑائی کا انحصار ہمارے جیسے لوگوں سے فوجی راز حاصل کرنے پر ہے تو آپ اپنی لڑائی جیت چکے۔ کیوں کہ موجودہ زمانہ میں جنگی راز اتنا ٹاپ سیکریٹ ہوتا ہے کہ بعض اوقات وزیر دفاع کو بھی اس کی خبر نہیں ہوتی۔ تقریباً آدھ گھنٹہ تک میں اس قسم کی باتیں کرتا رہا۔ اس کے بعد سلام کئے بغیر خیمے کے باہر نکل آیا۔ مذکورہ میجر مکمل خاموشی کے ساتھ میری باتوں کو سنتا رہا۔ جب میں باہر نکلا تو وہ بھی میرے پیچھے پیچھے باہر

آگیا۔اس نے کہا: مولانا صاحب، ہم کو آپ ہی جیسے لوگوں کی ضرورت ہے۔

میری زندگی کے سیکڑوں واقعات میں سے یہ صرف چند واقعات ہیں جو بتاتے ہیں کہ مجھے اپنے وطن سے کتنا زیادہ لگاؤ ہے۔ جو ہندو مجھے قریب سے جانتے ہیں، مثلاً سوامی اوم پورن سوتنترا (نئی دہلی) یا سوامی چیدانند (رشی کیش) وہ کہتے ہیں کہ تمہارے اندر جو دیش بھگتی ہے اس کی مثال ہم نے مہاتما گاندھی کے بعد کسی اور کے اندر نہیں دیکھی۔ میرے دل کی یہی تڑپ ہے جو مجھ کو مذکورہ قسم کی باتیں کہنے پر مجبور کرتی ہے۔

۲۰ جنوری ۱۹۹۷ کو نئی دہلی میں پانیر ہاؤس میں ایک میٹنگ ہوئی۔ اس میں شہر کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ شریک تھے۔ اس میٹنگ کا موضوع تھا: کیا گاندھی آج کے ہندستان میں کامیاب ہوتے۔ میں نے اس موقع پر ایک لمبی تقریر کی اس سلسلہ میں میں نے کہا کہ گاندھی پچھلے انڈیا میں بھی کامیاب نہیں ہوئے یہاں تک کہ ۱۹۴۷ میں انھیں خود یہ کہنا پڑا کہ: اب میری کون سنے گا۔ پھر گاندھی جب پچھلے انڈیا میں کامیاب نہیں ہوئے تو آج کی انڈیا میں وہ کس طرح کامیاب ہوتے۔ ایک ہندو پروفیسر نے میری بات سن کر کسی قدر برہمی کے ساتھ کہا کہ آپ مہاتما گاندھی پر تنقید کر رہے ہیں یہ سن کر میرا دل تڑپ اٹھا میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں نے درد بھرے لہجے میں کہا۔

I love Gandhi but I love India more than Gandhi

میری یہ بات سن کر پروفیسر صاحب خاموش ہوگئے۔ اس کے بعد کسی نے بھی میری تنقیدی تقریر کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ میری یہ تقریر مکمل طور پر انگریزی اخبار پانیر (نئی دہلی) کے شمارہ ۲۶ جنوری ۱۹۹۷ میں چھپ چکی ہے۔

انگریزی میگزین سنڈے کے شمارہ ۱۹۔۲۵ نومبر ۱۹۹۵ میں مسٹر ارن شوری کا ایک تفصیلی انٹرویو چھپا۔ اس کے انٹرویور منی شنکر ایر تھے۔ اس انٹرویو میں مسٹر ارن شوری نے جو باتیں کہیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ ایک اچھے مسلمان (good muslim) کا ایک اچھا انڈین (good Indian) ہونا بہت مشکل ہے۔ میں نے اس انٹرویو کو پڑھنے کے بعد مسٹر ارن شوری کو

ٹیلی فون کیا۔ میں نے کہا: یہ بتایئے کہ میں گڈ مسلم ہوں یا نہیں۔ انھوں نے کہا کہ کون کہہ سکتا ہے کہ آپ گڈ مسلم نہیں ہیں۔ میں نے کہا کہ پھر سن لیجئے کہ میں ایک گڈ مسلم بھی ہوں اور گڈ انڈین بھی ہوں۔ یہ کہتے ہوئے میری زبان سے نکلا: اگر میں گڈ انڈین نہیں ہوں تو مہاتما گاندھی بھی گڈ انڈین نہیں تھے۔

اس واقعہ کے چند روز بعد ڈاکٹر مہیش چندر شرما (ممبر پارلیمنٹ) میرے دفتر میں ملاقات کے لئے آئے۔ میں نے ان سے مذکورہ گفتگو نقل کی۔ انھوں نے اس کو سن کر کہا: مولانا صاحب، آپ کے گڈ انڈین ہونے کے لئے کسی ارن شوری کے سرٹفکٹ کی ضرورت نہیں۔ آپ ایسے کسی سرٹفکٹ کے بغیر ہی گڈ انڈین ہیں۔

میری بعض تنقیدوں کو سن کر ایک تعلیم یافتہ ہندو نے کہا کہ آپ ہمارے قومی لیڈروں کی اتنی سخت آلوچنا کرتے ہیں۔ آخر کس نے آپ کو اس کا ادھکار دیا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ میری دیش بھکتی (حب الوطنی) سے مجھ کو یہ ادھکار پراپت ہوا ہے۔ یہ سن کر وہ چپ ہو گئے۔

۱۹۴۷ سے پہلے کسی ہندستانی کی دیش بھکتی کا ثبوت یہ ہوتا تھا کہ وہ انگریزوں کے خلاف بولتا ہو، یہ بہت سستا معیار تھا۔ کیوں کہ اس زمانہ کے حالات میں کسی آدمی کو انگریز کے خلاف بولنے کا یہ شاندار انعام ملتا تھا کہ وہ اچانک ملک کے اندر ہیرو بن جائے۔ مگر ۱۹۴۷ کے بعد قومی تعمیر کا مسئلہ تھا۔ اور قومی تعمیر میں آدمی کو خود اپنی قوم کے خلاف بولنا پڑتا ہے۔ اس دوسرے معیار پر صرف مہاتما گاندھی پورے اترتے ہیں۔ تقسیم کے بعد پاکستان کو ۵۵ کروڑ روپیہ دینے کا سوال ایک انتہائی نازک اور حساس سوال تھا۔ اس حساس سوال پر مہاتما گاندھی واحد شخص تھے جو نازک قومی جذبات کے خلاف بولے۔ مہاتما گاندھی کے سوانح نگار لوئی فشر کے مطابق، مہاتما گاندھی کو جو گولی ماری گئی وہ اس معاملہ میں ان کے موقف کی قیمت تھی۔

میں سمجھتا ہوں کہ پچھلے پچاس سال کے دوران دیش کے لئے اس قسم کی نازک قربانی کی دوسری مثال صرف وہ ہے جس کی توفیق مجھے اللہ کی خصوصی مدد سے حاصل ہوئی۔ بابری مسجد کا سوال تمام مسلمانوں کے لئے وقار کا سوال بن گیا تھا۔ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو جب مشتعل ہندوؤں کی ایک

بھیڑ نے بابری مسجد کو ڈھادیا تو تمام مسلمانوں کے اندر غصہ کی آگ بھڑک اٹھی ۔ جذبات سے بے قابو ہو کر وہ کچھ بھی کرنے کے لئے تیار ہو گئے ۔ یہ ایک انتہائی نازک صورت حال تھی۔ لوگوں کے جذبات اتنے زیادہ بھڑکے ہوئے تھے کہ ملک کے دونوں بڑے فرقوں کے درمیان خونی ٹکراؤ کی حالت پیدا ہو گئی۔ اس وقت اپنی زندگی کا مشکل ترین رسک (risk) لے کر میں لوگوں کے سامنے آیا اور دونوں فرقوں کے سامنے یہ دو نکاتی فارمولا پیش کیا کہ---- مسلمان ایک مسجد کے سوال پر چپ ہو جائیں، اور ہندو بقیہ مسجدوں کے سوال پر چپ ہو جائیں۔

یہ بات اس وقت کے ماحول میں آگ پر پٹرول ڈالنے کے ہم معنی تھی۔ وقتی طور پر لوگ میری جان کے دشمن ہو گئے قوم کی طرف سے مجھے سخت غضبنا کی کا شکار ہونا پڑا مگر دھیرے دھیرے حالات بدلے اور لوگوں نے جان لیا کہ یہی واحد فارمولا تھا جس سے ملک کو ایک عظیم تباہی سے بچانا ممکن ہو سکا۔

07

میرے وطن اعظم گڑھ میں سب سے پہلی موٹر کار راجہ ہرکھ چند نے منگوائی تھی۔ یہ تقریباً ستر سال پہلے کی بات ہے۔ اس کے بعد شہر کی دوسری کار وہ تھی جو ہمارے خاندان نے خریدی۔ یہ فورڈ کا پرانا ماڈل تھا۔ جس کے اوپر موجودہ تھری ویلر کے مانند کپڑا ہوا کرتا تھا۔ میں اس زمانہ میں اس موٹر کار کو دیکھتا تھا اور اس پر بیٹھتا تھا۔ اس کار کی حیثیت گویا ایک سائنسی واقعہ کی تھی۔ مگر اس نے میرے اندر کسی بھی درجہ میں کوئی سائنٹفک تھنکنگ پیدا نہیں کی۔

یہ کار کیا تھی، وہ امریکا کے ہنری فورڈ (وفات ۱۹۴۷) کی سر تاپا سائنسی زندگی کا ایک صنعتی نمونہ تھا۔ وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ ایک سائنسی انسان کی یاد دلاتی تھی۔ اس کے ساتھ وہ فورڈ سے پہلے کے ان انسانوں کی یاد دلاتی تھی جنھوں نے اپنی زندگیاں سائنسی میدان میں وقف کر دیں۔ یہاں تک کہ وہ اس قابل ہوئے کہ وہ فطرت کے اس راز کو دریافت کر سکیں کہ جامد مادہ کو کس طرح متحرک مشین میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ مذکورہ کار گویا ان باتوں کا ایک خاموش اعلان تھی۔ مگر میرے ذہن میں کبھی اس قسم کے سوالات نہیں ابھرے اور نہ میں نے کبھی ان

کے بارے میں جاننے کی کوئی کوشش کی۔ آج میں سوچتا ہوں کہ مجھ میں اور ہنری فورڈ میں یہ فرق کیوں تھا۔ ہنری فورڈ نے اپنی پوری زندگی سائنس اور ٹکنالوجی کے مطالعہ میں صرف کردی اس نے اپنے رات دن کے تمام لمحات کو انہیں تجربات میں گذار دیا یہاں تک کہ وہ پہلی سب سے بڑی موٹر کمپنی بنانے میں کامیاب ہوا۔ جب کہ میرا یہ حال تھا کہ جزئی طور پر فورڈ کا ہم عصر ہوتے ہوئے میں اس قسم کے شعور تک سے بالکل خالی تھا۔ اس فرق کا سبب دونوں کے ماحول کا فرق ہے۔

ہنری فورڈ ۱۸۶۳ء میں امریکا کے ایک شہر میں پیدا ہوا۔ اس وقت امریکا میں ہر طرف سائنس اور طبیعاتی علوم کا چرچا تھا۔ اس ماحول میں پرورش پانے والا ہر نوجوان کسی ارادے کے بغیر خود بخود سائنسی باتوں سے مانوس ہو جاتا تھا۔ اس کے اندر اپنے آپ ہی سائنسی واقفیت حاصل کرنے کا شوق پیدا ہو جاتا تھا۔ یہی ماحول ہے جس نے انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول کے زمانہ نے امریکا میں ہزاروں سائنسداں پیدا کئے۔ مگر میں اپنے وطن اعظم گڈھ میں اس قسم کے ماحول سے مکمل طور پر محروم تھا۔ اس محرومی کی ذمہ داری اس زمانہ کے ان رہنماؤں پر ہے جو اپنی بے شعوری کی بنا پر اس قسم کا ماحول نہ بنا سکے۔

اس زمانہ کے رہنماؤں نے ہمارے معاشرہ کا جو ماحول بنایا وہ کیا تھا...... سطحی سیاست، آزادی کے کھوکھلے نعرے، ادب اور شاعری، داستان امیر حمزہ اور الف لیلیٰ جیسی کتابوں کو پڑھنا، فرضی قصے کہانیاں سننا اور سنانا، وغیرہ۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، تقریباً پورا مسلم معاشرہ ہمارے رہنماؤں کے پیدا کردہ اسی قسم کے ماحول میں جی رہا تھا۔ میرے علم کے مطابق برصغیر ہند کا کوئی بھی گوشہ ایسا نہیں جو اس زمانہ میں اس عام صورت حال سے مستثنیٰ قرار دیا جاسکتا ہو۔

گھر کے ماحول سے نکل کر جب میں عربی اور دینی تعلیم کے لئے مدرسہ میں پہنچا تو وہاں بھی عین یہی ماحول تھا۔ حتی کہ اس زمانہ میں مسلم رہنماؤں نے جدید تعلیم کے نام سے جو ادارے بنائے وہاں بھی حقیقی معنوں میں سائنسی ماحول کا کوئی وجود نہ تھا۔ پہلی بار جب میں مسلم یونیورسٹی (علیگڑھ) گیا اور وہاں "سر سید روم" کو دیکھا تو مجھے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ سر سید (۱۸۹۸)

انیسویں صدی کے نصف آخر میں جب لندن گئے تو وہاں کی سب سے زیادہ قیمتی چیز جو انھوں نے ہندستان لانے کے قابل سمجھی وہ قدیم وضع کا ایک صوفہ سٹ تھا۔ وہاں سے وہ نہ کوئی مشین لائے اور نہ کوئی سائنسی کتاب۔

میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ زمانے میں برصغیر ہند کا سب سے بڑا المیہ یہی ہے۔ اس زمانہ میں یورپ اور امریکا کے لوگ سائنسی انقلاب لانے میں مصروف تھے۔ مگر جیسا کہ عرض کیا گیا، عین اسی زمانہ میں برصغیر ہند میں اس سے بالکل مختلف چیزیں لوگوں کے ذہنوں پر چھائی ہوئی تھیں۔ آزادی کے کھوکھلے نعرے، نثر اور نظم میں خیالی مضمون بندیاں، مذہب کے نام پر سطحی بحثیں، ماضی پر فخر اور حال سے بے خبری، انسانوں سے محبت کرنے کے بجائے ان کو اپنا دشمن بتا کر ان سے نفرت کرنا، حقائق فطرت میں جینے کے بجائے مفروضات اور توہمات میں جینا۔ یہی وہ چیزیں تھیں جو اس زمانہ میں برصغیر ہند میں عمومی طور پر چھائی ہوئی تھیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ زمانے میں مسلمانوں (نیز ہندوؤں) کے تمام مسائل کی جڑ ان کی یہی مشترک فکری پس ماندگی ہے۔ اسی بات کو جواہر لال نہرو نے اپنے آخری زمانہ میں اس طرح کہا تھا کہ ہمارے دیش میں سب سے زیادہ جس چیز کی کمی ہے وہ سائنٹفک ٹمپر ہے۔ ماضی میں اگر ہمارے یہاں ایسے صاحب بصیرت لیڈر ابھرتے جو لوگوں کے اندر صحیح سوچ پیدا کرتے تو آج ہم اس کا مثبت نتیجہ پا رہے ہوتے۔ اب بھی اگر کوئی امید کا پہلو ہے تو وہ یہی ہے کہ ہمارے درمیان آج ایسے رہنما ابھریں جو دور رس نظر رکھتے ہوں اور سماج کو ایسی بنیاد پر کھڑا کریں جو مستقبل کے اعتبار سے نتیجہ خیز ہو اس کے بغیر نہ پہلے کوئی امید کی جا سکتی تھی اور نہ آئندہ کی جا سکتی ہے۔

08

۱۹۴۶ میں یہ بات واضح ہو گئی کہ اب انڈیا کو انگریزوں سے آزاد ہونا ہے۔ لوئی فشر کے بیان کے مطابق، ۵ دسمبر ۱۹۴۶ میں مہاتما گاندھی نے لکھا کہ۔ اس ملک کے ہندو اور مسلمان دونوں کو امن اور میل ملاپ کے ساتھ رہنا ہے ورنہ اس کی کوشش میں میں اپنی جان دے دوں گا:

Hindus and Muslmans should learn to live together in peace and amity otheriwse I should die in the attempt .(p.449)

یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ برصغیر ہند کی تقسیم نفرت کی بنیاد پر ہوئی۔ نفرت کی یہ لہر ۱۵اگست ۱۹۴۷ کو اچانک ختم نہیں ہو سکتی تھی۔ فطری طور پر ایسا ہوا کہ یہ نفرت اس کے بعد بھی سرحد کے دونوں طرف جاری رہی۔ بلکہ مختلف اسباب کے تحت اس میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ یہ بلاشبہ ملک کے مستقبل کی تعمیر کے لئے سب سے بڑا خطرہ تھا۔ دو پڑوسیوں میں اگر نفرت اور عداوت کی فضا ہو تو دونوں میں سے کوئی ایک بھی ترقی نہیں کر سکتا۔ مگر میرے علم کے مطابق پورے برصغیر میں صرف ایک شخص تھا، یعنی مہاتما گاندھی۔ جو اس حقیقت کو شعوری طور پر جانتا تھا۔ اس نے اس راہ میں اپنی آخری کوششیں بھی صرف کردیں۔ مگر مشن کی تکمیل سے پہلے آزادی کے جلد ہی بعد ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ کو گولی مار کر گاندھی کو ہلاک کر دیا گیا۔ اگلی صبح کو تمام اخباروں نے اس کو اپنی پہلی خبر بنایا۔ امرت بازار پتر کا کی سرخی ان الفاظ میں تھی:

Gandhi sacrificed by fanaticism

ہندو مسلم اتحاد، اور اسی طرح انڈیا اور پاکستان کے درمیان پر امن تعلقات بلاشبہ اس برصغیر کی سب سے بڑی ضرورت ہیں۔ اس فضا کو پیدا کئے بغیر برصغیر میں کوئی ترقی ممکن نہیں ہو سکتی، نہ ایک کے لئے اور نہ دوسرے کے لئے۔

مگر اس رخ پر ابھی تک کوئی مؤثر کوشش نہ کی جا سکی۔ مہاتما گاندھی نے اس کو اپنا آخری مشن بنا کر اپنی پوری زندگی اس کے لئے وقف کرنے کا فیصلہ کیا تھا مگر مشن کے آغاز ہی میں ان کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ ان کے بعد میرے خیال کے مطابق، کوئی بھی قابل ذکر شخص اس خاص مقصد کے لئے نہ اٹھا، نہ ہندوؤں میں اور نہ مسلمانوں میں۔

ہندوؤں میں پنڈت جواہر لال نہرو اور مسلمانوں میں مولانا ابوالکلام آزاد۔ اس قابل تھے کہ وہ گاندھی کے اس ناتمام مشن کو پورا کر سکیں۔ مگر ان لوگوں نے اس رخ پر کوئی سنجیدہ کوشش نہ کی۔

اگر پنڈت نہرو پرائم منسٹر نہ بنتے۔ اس کے بجائے وہ گاندھی کے مذکورہ مشن کی تکمیل کے لئے ایک انگریزی میگزین نکالتے۔ اسی طرح مولانا آزاد وزیر تعلیم نہ بنتے اس کے بجائے وہ

ہندو مسلم اتحاد کے مقصد کے تحت ایک اردو میگزین جاری کرتے تو یہی دو افراد دس سال کے اندر پورے ملک میں ایک نیا فکری انقلاب لانے کے لئے کافی تھے۔

09

انسان کے لئے سب سے زیادہ تباہ کن نفسیات انتقام کی نفسیات ہے۔ انتقام کی سب سے بڑی برائی یہ ہے کہ اس کا کوئی خاتمہ نہیں۔ ہر انتقام کا دوبارہ انتقام لیا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ تباہ کن سلسلہ اس وقت تک ختم نہیں ہوتا جب تک کہ خود انتقام لینے والوں کا خاتمہ نہ ہو جائے۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو ہندستان کا بٹوارہ ہوا۔ اس بٹوارہ کے ذمہ دار بلاشبہ ہندستانی مسلمان تھے۔ ہندستانی مسلمانوں نے مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے اتحاد پسند قائدین کو رد کر دیا اور مسٹر محمد علی جناح کی قیادت میں ملک کے بٹوارے کا طوفانی مطالبہ کیا۔ ہندو قیادت نے تحریک کے آخری مرحلہ میں اس کو ناگزیر برائی (necessary evil) کے طور پر مان لیا۔

یہ ہندو ذہن کے لئے نہایت سخت صدمہ تھا۔ تاہم یہ عین ممکن تھا کہ فطرت کا خاموش عمل اس کو فراموشی کے خانہ میں ڈال دے۔ مگر پاکستان کی مسلسل حریفانہ پالیسی نے یہ نوبت نہ آنے دی کے ہندو ذہن بٹوارے کے صدمہ کو بھلا دے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو قیادت نے بلا اعلان بٹوارہ کا انتقام لینے کا فیصلہ کیا۔ سابق مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) میں شیخ مجیب الرحمٰن کی علیحدگی پسند تحریک نے ہندو قیادت کو موقع دیا۔ چنانچہ اس نے شیخ مجیب الرحمٰن کا ساتھ دے کر ۱۹۷۱ میں پاکستان کے دو ٹکڑے کر دیئے۔

ہندو قائدین اگر دانشمند ہوتے تو وہ پیشگی طور پر اس حقیقت کو جان لیتے کہ مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ وہ خود بنگالیوں کے ہاتھوں بنے۔ مگر اس وقت کے ہندو قائدین کی منفی ذہنیت ان کے لئے اس حقیقت کو سمجھنے میں رکاوٹ بن گئی۔ وہ یہ جاننے سے قاصر رہے کہ بنگلہ دیش کی تحریک میں ان کی شمولیت ان کے لئے ایک بوم رینگ کھیل ثابت ہوگا۔ اور دوبارہ انتقام کا انتقام لیا جائے گا۔ مگر وہ اس حقیقت کو نہ سمجھ سکے یہاں تک کہ انتقام

در انتقام کا ایک لامتناہی سلسلہ بر صغیر ہند میں جاری ہو گیا۔

10

میرے بچپن کے زمانہ میں میرے وطن کے قریب مدرسۃ الاصلاح کے میدان میں ایک عمومی جلسہ ہوا اطراف کے مسلمان ہزاروں کی تعداد میں امنڈ آئے۔ اس جلسہ کے خصوصی مقرر مولانا محمد علی جوہر (وفات ۱۹۳۱) تھے۔ انہوں نے اپنے مخصوص جوشیلے انداز میں تقریر کی اس وقت لاؤڈ اسپیکر نہیں ہوتا تھا۔ مگر مولانا محمد علی اتنے گرج دار انداز میں بولتے تھے کہ لاؤڈ اسپیکر کے بغیر ہی ہزاروں آدمی ان کی بات سن سکتے تھے۔ مولانا محمد علی کی تقریر ختم ہوئی تو ایک بوڑھا مسلمان اٹھا بھیڑ کو چیرتا ہوا وہ اسٹیج کے پاس پہنچا۔ اس نے مولانا محمد علی کی پیٹھ پر اپنا ہاتھ مارتے ہوئے اپنی دیہاتی زبان میں کہا کہ: محمد علی جون تیں کیہے کیہو نہ کیہس (محمد علی، جو تو نے کیا کسی نے نہیں کیا)

خلافت تحریک کے زمانہ میں محمد علی اور شوکت علی کی تقریروں نے پورے ملک میں غلغلہ پیدا کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ مولانا شوکت علی نے ایک موقع پر کہا کہ: گاندھی میری جیب میں ہے۔ اس زمانہ میں مولانا محمد علی کے دبدبہ کا یہ عالم تھا کہ کانپور کے محلّہ مچھلی بازار کی مسجد کے ساتھ ۱۹۱۳ میں ایک واقعہ پیش آیا۔ اس وقت کی انگریز حکومت نے مسجد کا غسل خانہ سڑک کی توسیع کے لئے توڑ دیا۔ اس پر لیڈروں کی تقریروں نے مسلمانوں کے اندر اتنا جوش پیدا کیا کہ لوگ بغاوت پر آمادہ ہو گئے۔ پولس نے گولی چلائی جس میں بہت سے مسلمان مارے گئے۔

جب یہ ہنگامہ جاری تھا، مولانا محمد علی ٹرین سے سفر کر کے کانپور پہنچے ریلوے اسٹیشن پر مسلمانوں کی بھیڑ ان کے استقبال کے لئے موجود تھی۔ کہا جاتا ہے کہ یوپی کا انگریز گورنر اس وقت کانپور میں تھا اور کھانے کے میز پر کھانا کھا رہا تھا۔ عین اس وقت اس کو خبر دی گئی کہ مولانا محمد علی کانپور پہنچ گئے ہیں۔ انگریز گورنر نے یہ خبر سنی تو چمچہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ مگر سوال یہ ہے کہ مولانا محمد علی کی زلزلہ خیز قیادت نے ہندستانی مسلمانوں کو کیا دیا۔ قیادت مستقبل کی تعمیر کے لئے ہوتی ہے نہ کہ وقتی دھوم کے لئے۔ مگر میرے علم کے مطابق مولانا محمد علی نے

اپنے بعد کوئی ایسی چیز نہیں چھوڑی جو مثبت معنوں میں بعد کے مسلمانوں کے لئے مفید ہو۔

البتہ اپنی پرجوش طبیعت کی بنا پر انھوں نے ایسی باتیں کہیں جو مسلمانوں کے لئے آج تک مسئلہ بنی ہوئی ہیں۔

خلافت تحریک کے زمانہ میں مہاتما گاندھی بھی ان کے ساتھ ہو گئے تھے۔ اس زمانہ میں ایک بار ایسا ہوا کہ مولانا محمد علی نے دلی کی جامع مسجد میں مسلمانوں کا ایک جلسہ کیا۔ وہ مہاتما گاندھی کو بھی اس جلسہ میں لے گئے۔ مہاتما گاندھی نے وہاں ممبر پر بیٹھ کر تقریر کی۔ یہ واقعہ مسلمانوں کی برہمی کا سبب بن گیا۔ کچھ لوگوں نے اس واقعہ کو لے کر مولانا محمد علی کو بدنام کرنا شروع کر دیا۔ یہ ایک نازک صورت حال تھی۔ مولانا محمد علی نے اس موقع پر اپنا دفاع اس طرح کیا کہ انھوں نے کہا: جہاں تک سیاست کا تعلق ہے، میں مہاتما گاندھی کو اپنا لیڈر سمجھتا ہوں۔ مگر جہاں تک مذہب کا تعلق ہے تو میرے نزدیک ایک فاسق وفاجر مسلمان بھی مہاتما گاندھی سے اچھا ہے۔

ایک عام آدمی اگر اس طرح کی بات کہے تو وہ نیوز (خبر) نہیں بنتی۔ مگر جب ایک مشہور لیڈر اس قسم کی بات کہے تو وہ نیوز بن کر فوراً ہر طرف پھیل جاتی ہے۔ چنانچہ مولانا محمد علی کی اس بات پر ہندوؤں میں بہت زیادہ چہ می گوئیاں ہوئیں۔ میرے نزدیک مولانا محمد علی کا جواب درست نہ تھا۔ انھوں نے غیر ضروری طور پر بات کو اتنا پیچیدہ بنا دیا۔ وہ کہہ سکتے تھے کہ اگر میں مہاتما گاندھی کو مسجد میں لایا ہوں تو میں نے کوئی غیر اسلامی کام نہیں کیا۔ خود رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں غیر مسلم مسجد کے اندر آتے تھے اور ایسے بھی واقعات موجود ہیں کہ انھوں نے مسجد کے اندر تقریر کی۔ اور اس کو کوئی برا نہیں مانا۔

اس کے مقابلہ میں مہاتما گاندھی کا انداز دیکھئے۔ اس واقعہ کے بعد غالباً کلکتہ میں کانگریس کا سالانہ اجلاس ہوا۔ وہاں مہاتما گاندھی اور مولانا محمد علی دونوں موجود تھے۔ جب اجلاس شروع ہونے والا تھا تو اچانک ایک سنسنی خیز واقعہ ہوا۔ مہادیو ڈیسائی اچانک اسٹیج پر آئے۔ انھوں نے بلند آواز سے کہا کہ میں اجلاس کی کارروائی ہونے نہیں دوں گا۔ مولانا محمد علی نے مہاتما گاندھی کی

توہین کی ہے۔ سب سے پہلے وہ یہاں آکر معافی مانگیں۔ اس کے بعد ہی جلسہ شروع ہوگا۔

مہادیو ڈیسائی کے اس پرجوش اعلان کے بعد جلسہ گاہ میں ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ لوگوں کی نظریں مولانا محمد علی پر پڑنے لگیں مگر مولانا محمد علی اس کے لئے تیار نہیں ہوئے کہ وہ کھڑے ہو کر برسرِ عام معافی مانگیں۔ غالباً انھیں ڈر تھا کہ اگر انھوں نے ایسا کیا تو جلسہ گاہ سے نکلنے کے بعد مسلمان ان کا دامن پکڑیں گے اور ان کو مطمئن کرنا ان کے لئے سخت مشکل ہوگا۔

کچھ دیر یہ حالت طاری رہی اس کے بعد ایک انوکھا واقعہ ہوا۔ مہاتما گاندھی جو اسٹیج پر دوسری طرف موجود تھے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور چلتے ہوئے مولانا محمد علی کے پاس پہنچے۔ انھوں نے مولانا محمد علی کے گلے میں اپنی باہیں ڈال دیں اور کہا: میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔ یہ سن کر لوگ ہنس پڑے اور جو بات بے حد سنگین نظر آتی تھی وہ ایک لمحہ میں ختم ہوگئی اور اپنے معمول کے مطابق جلسہ شروع ہوگیا۔

11

کشمیر کی متشددانہ تحریک ۱۹۷۹ کے آخر میں شروع ہوئی۔ چند سال بعد میری ملاقات کچھ پاکستانی دانشوروں سے ہوئی۔ میں نے کہا کہ آپ لوگ کیوں کشمیر میں خونی تحریک چلا رہے ہیں، جب کہ آپ یقینی طور پر جانتے ہوں گے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ کشمیر میں جو کچھ ہوا وہ تاریخ کا ایک فیصلہ تھا، اور تاریخ کے فیصلہ کو اس قسم کے گن کلچر کے ذریعہ بدلنا ممکن نہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہم بھی اس حقیقت کو جانتے ہیں مگر ہم بنگلہ دیش کو بھلا نہیں سکتے۔ ہمیں انڈیا سے ۱۹۷۱ کا انتقام لینا ہے۔

میں نے کہا کہ آپ لوگ مسلم دانش ور سمجھے جاتے ہیں مگر آپ کے اس جواب کا دانشوری سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ایک جھوٹی دانشوری ہے۔ سچی دانشوری کیا ہے۔ اس کی ایک مثال میں آپ کو بتاتا ہوں۔

آپ جانتے ہیں کہ امریکہ نے ۱۹۴۵ میں جاپان کے اوپر پہلی بار ایٹم بم گرایا۔ جاپان کا سب سے بڑا صنعتی شہر ہیروشیما بالکل تباہ ہوگیا۔ یہ جاپانیوں کے لئے ایک ناقابل برداشت صدمہ تھا۔

وہاں کے لوگوں میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی۔ وہ ہیرا کری (خودکش بمباری) کی حد تک جاکر امریکہ سے انتقام لینے کے لئے تیار ہوگئے۔ اس وقت کچھ جاپانی دانشور اٹھے انھوں نے تقریر و تحریر کے ذریعہ اپنی قوم کی انتقامی آگ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ۱۹۴۵ میں اگر امریکہ نے ہمارے ہیروشیما کو تباہ کیا ہے تو ہم بھی اس سے پہلے ۱۹۴۱ میں امریکہ کے پرل ہاربر کو تباہ کر چکے تھے اس لئے معاملہ برابر ہو گیا۔ آؤ اب ماضی کو بھلا کر ملک کا نیا مستقبل تعمیر کرنے کی کوشش کریں۔ یہی وہ مثبت رہنمائی تھی جس کا یہ شاندار نتیجہ نکلا کہ دوسری عالمی جنگ میں تباہ ہونے والا جاپان صرف چالیس سال کے اندر ایک عالمی اقتصادی طاقت بن گیا۔

یہ واقعہ بتا کر میں نے پاکستانی دانشوروں سے کہا کہ اگر آپ لوگوں کے اندر حقیقی دانشوری ہوتی تو جاپانی دانشوروں کی طرح آپ بھی اپنی قوم سے یہ کہتے کہ ------انڈیا نے اگر ۱۹۷۱ میں ہمارے ملک کو توڑا تو ہم بھی اس سے پہلے ۱۹۴۷ میں ان کے ملک کو توڑ چکے تھے۔ اس طرح معاملہ برابر ہو گیا۔ آؤ اب ماضی کی باتوں کو بھلادیں اور مثبت ذہن کے تحت ملک کے مستقبل کی تعمیر کریں۔

پاکستان کے دانشور اگر منفی سوچ سے بلند ہوتے تو وہ وہی کرتے جو جاپانی دانشوروں نے کیا۔ وہ اپنی قوم کو انتقام کی دلدل سے نکالتے اور لوگوں کے اندر مثبت اور تعمیری ذہن پیدا کرتے۔ اگر ایسا ہوتا تو آج پاکستان بلاشبہ ایشیا کا ایک انتہائی ترقی یافتہ ملک ہوتا، نہ کہ ایک تباہ شدہ ملک جیسا کہ آج وہ دکھائی دیتا ہے۔

12

برصغیر ہند میں بہت پہلے سے ہندو مسلم مسئلہ موجود تھا۔ ۱۹۴۷ سے پہلے مختلف نزاعات کی صورت میں اس کی مثالیں سامنے آتی رہتی تھیں۔ ہمارے رہنما برابر اس مسئلہ پر غور کرتے تھے۔ آخر کار اس معاملہ میں دو نظریے زیادہ ابھرے۔ ایک، مہاتما گاندھی کا نظریہ۔ دوسرا، مسٹر محمد علی جناح کا نظریہ۔ مہاتما گاندھی کا حل فکری نوعیت کا تھا اور مسٹر محمد علی کا حل عملی نوعیت کا۔

مہاتما گاندھی کا کہنا تھا کہ یہ نزاعات زیادہ تر مذہبی نوعیت کے ہیں۔ مذہبی اختلافات بڑھ کر جھگڑے کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کا حل ان کی سمجھ میں یہ آیا کہ لوگوں کو یقین دلایا جائے کہ مذاہب میں کوئی اختلاف نہیں۔ اسلام بھی ایک سچا مذہب ہے اور اسی طرح ہندوازم بھی ایک سچا مذہب۔ اپنے اس نظریہ کو انھوں نے ایک جملے میں اس طرح بیان کیا کہ —— رام رحیم ایک ہے۔

یہ کوئی نیا نظریہ نہیں۔ چار سو سال پہلے شہنشاہ اکبر نے سیاسی طاقت کے ذریعہ اس کو رائج کرنا چاہا۔ ڈاکٹر بھگوان داس نے مذاہب کے بارے میں اپنے انسائیکلوپیڈیائی علم کے ذریعہ اس کو ثابت کرنے کی کوشش کی۔ مہاتما گاندھی نے اپنی قائدانہ مقبولیت کے ذریعہ اس کو عام کرنا چاہا۔ ونوبا بھاوے جیسی روحانی شخصیت نے اس کے لئے اپنی عمر صرف کر دی۔ مگر واقعات بتاتے ہیں کہ جہاں تک اصل مقصد کا تعلق ہے وہ ایک فیصد بھی حاصل نہیں ہوا۔

"تمام مذاہب سچے ہیں" کا نظریہ خود مذہب کی نفی ہے۔ مذہب کا مقصد انسان کو یقین کی نعمت دینا ہے۔ یقین اپنی ذات میں توحد چاہتا ہے نہ کہ تعدد۔ یقین کسی ایک ہی چیز کو حق ماننے سے پیدا ہو سکتا ہے۔ ہر چیز کو یکساں طور پر حق ماننا کبھی آدمی کے اندر یقین کی کیفیت پیدا نہیں کر سکتا۔

اس معاملہ کی ایک مثال خود مہاتما گاندھی کی زندگی میں موجود ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے عقیدے کو "رام رحیم ایک ہے" کے الفاظ میں بیان کرتے تھے۔ مگر ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ کو جب انھیں گولی ماری گئی تو موت سے پہلے جو آخری لفظ ان کی زبان سے نکلا وہ "ہے رام" ہے رحیم نہیں تھا۔ بلکہ صرف "ہے رام" تھا۔ کئی سچائی کی بات آپ ڈپلومیسی کے طور پر کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اگر آپ کو سچائی پر یقین ہے تو وہ لازماً صرف ایک سچائی ہو گی نہ کہ کئی سچائیاں۔

"تمام مذاہب ایک ہیں" کا نظریہ ایک غیر حقیقی نظریہ ہے۔ اس لئے وہ سرے سے قابل عمل ہی نہیں۔ اس قسم کے لوگ ظاہری نوعیت کی کچھ مشترک باتوں کو لے کر یہ کہنے لگتے ہیں کہ تمام مذاہب ایک ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ان کے درمیان انتہائی اساسی اختلافات پائے

جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر اسلام اور ہندوازم کو لیجئے رام اور رحیم یا نوح اور منو جیسے ناموں کی لفظی مشابہت سے یکسانیت ثابت کرنا کوئی علمی استدلال نہیں۔ علمی استدلال کا طریقہ یہ ہے کہ دونوں کی اساسی تعلیمات کا موازنہ کیا جائے۔ مذکورہ استدلال ایسا ہی ہے جیسے کہا جائے کہ ہندستان اور کیوبا دونوں ایک ہیں کیونکہ یہاں بھی درخت ہیں اور وہاں بھی درخت، یہاں بھی سمندری ساحل ہے اور وہاں بھی سمندری ساحل۔

میں پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میرے دل میں ہر انسان کے لئے یکساں احترام ہے، خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان۔ مگر میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ تمام مذاہب ایک ہیں، یعنی ایک مذہب کی کتاب میں جو تعلیم ہے وہی تعلیم دوسرے مذہب کی کتاب میں بھی ہے۔ اس قسم کا نظریہ یقینی طور پر ایک غیر علمی اور غیر واقعی نظریہ ہے۔

مثال کے طور پر ہندوازم میں خدا کی بابت وحدتِ وجود (monism) کا تصور ہے اور اسلام میں اس کے برعکس توحید (monotheism) کا تصور۔ توحید کے مطابق، خدا مخلوقات سے الگ ہے۔ وہ ایک مستقل ہستی کی حیثیت رکھتا ہے، جب کہ وحدت وجود میں خالق اور مخلوق کی علیحدگی کا کوئی تصور نہیں۔ اس کے مطابق، ہر چیز ایک ہی غیر متشخص حقیقت کا مختلف اور متنوع اظہار ہے۔ چنانچہ آپ کو ایسے ہندو ملیں گے جو اپنا یہ عقیدہ بیان کرتے ہوئے نعوذ باللہ یہ کہیں گے کہ: سو دیر از نوڈفرینس بٹوین جی او ڈی اینڈ ڈی او جی۔

اسی طرح اسلام میں پیغمبر خدا کا تصور ہے اور ہندوازم میں تجسیم خدا کا تصور۔ اسلام میں موت کے بعد جنت اور جہنم کا تصور ہے اور ہندوازم میں آواگمن کا تصور وغیرہ۔ مزید یہ کہ ''تمام مذاہب ایک ہیں'' کا نظریہ اہل مذاہب کے درمیان ہم آہنگی کے مقصد کے لئے کسی بھی درجہ میں کار آمد نہیں۔ اس کا ایک تجرباتی ثبوت یہ ہے کہ کسی ایک مذہب کے ماننے والوں کے درمیان عملاً آج بھی یہ اعتقادی یکسانیت موجود ہے، اس کے باوجود ان کے درمیان برابر داخلی لڑائیاں جاری رہتی ہیں۔

مہا بھارت کی لڑائی میں کورو اور پانڈو دونوں ہندو دھرم کو مانتے تھے۔ اس کے باوجود ان

کے درمیان خونیں لڑائی ہوئی۔ پہلی اور دوسری عالمی جنگ کے دونوں فریق زیادہ تر عیسائی تھے اس کے باوجود ان کے درمیان تاریخ کی سب سے زیادہ ہولناک جنگ ہوئی۔ افغانستان اور دوسرے مسلم ملکوں میں آج جو داخلی لڑائیاں جاری ہیں اس کے دونوں فریق اسلام کو اپنا مذہب بتاتے ہیں۔اس کے باوجود وہ دشمنوں کی طرح ایک دوسرے کے خلاف لڑ رہے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ اس مسئلہ کا حل مذہبی یکسانیت نہیں بلکہ مذہبی رواداری ہے۔اہل مذاہب کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کا راز باہمی اعتراف (mutual recognisation) میں نہیں ہے بلکہ باہمی احترام (mutual respect) میں ہے۔اس مسئلہ کا حل یہ ہے کہ لوگوں میں ٹالرنس کی اسپرٹ پیدا کی جائے،نہ کہ بے فائدہ طور پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جائے کہ تمام مذاہب ایک ہیں۔

اس معاملہ میں مہاتما گاندھی کا نظریہ اگر بے فائدہ تھا تو مسٹر محمد علی جناح کا پیش کردہ حل صرف الٹا نتیجہ پیدا کرنے والا تھا۔ ۱۹۴۷ سے پہلے یہ مسئلہ دو بے اقتدار کمیونٹی کے درمیان تھا، کیونکہ اس وقت سیاسی اقتدار انگریزوں کو حاصل تھا جو اپنے سیاسی مصالح کے تحت ہندوؤں اور مسلمانوں میں موازنہ قائم کرنے کا رول ادا کر رہے تھے۔ مگر مسٹر محمد علی جناح کے فارمولے کے تحت جب ہندو انڈیا (بھارت) اور مسلم انڈیا (پاکستان) بنا تو دو کمیونٹی کا مسئلہ مزید اضافہ کے ساتھ دو اسٹیٹ کا مسئلہ بن گیا۔ پہلے جس اختلاف کا اظہار جلسوں اور مظاہروں کی سطح پر ہوتا تھا وہ اب مسلح مقابلہ کی سطح پر ہونے لگا۔ یہاں تک کہ بڑھتے بڑھتے وہ ''ہندو بم'' اور ''اسلامی بم'' تک جا پہنچا۔

حقیقت یہ ہے کہ جغرافی تقسیم کسی بھی درجہ میں ہندو مسلم مسئلہ کا حل نہیں۔اس کا حل پہلے بھی یہ تھا کہ دونوں فرقے اختلافات کو نظر انداز کرتے ہوئے باہم مل جل کر رہیں اور آج بھی اس کا حل یقینی طور پر یہی ہے۔ مزید یہ کہ اس تقسیم نے اس مساوات کو توڑ دیا جو انگریزوں نے قائم کر رکھا تھا۔ موجودہ پاکستان کے مقابلہ میں ہندستان پانچ گنا زیادہ بڑے ملک کی حیثیت رکھتا ہے۔ایسی حالت میں محاذ آرائی کی پالیسی کسی بھی درجہ میں پاکستان کے لئے مفید نہیں۔پاکستان

کے لئے زندگی کی واحد ضمانت یہ ہے کہ وہ نزاعی طریقہ کو مکمل طور پر چھوڑ دے۔ وہ یکطرفہ ایڈجسٹمنٹ کا طریقہ اختیار کرے۔ مگر بد قسمتی سے پاکستان میں کوئی بھی بے ریش یا باریش قائد نہیں جو اہل پاکستان کو اس قسم کا حقیقت پسندانہ مشورہ دے رہا ہو۔

13

ملک کی تقسیم (۱۹۴۷) کے بعد ہندستان اور پاکستان کے درمیان سیاسی جھگڑے ختم ہو جانا چاہئے تھا۔ مگر اس کے بعد بھی وہ مزید شدت کے ساتھ جاری رہا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی اصل وجہ کشمیر کا مسئلہ ہے۔ یہاں سوال یہ ہے کہ خود کشمیر کا مسئلہ کس نے پیدا کیا۔ تاریخی ریکارڈ بتاتا ہے کہ اس مسئلہ کو پیدا کرنے کی سب سے بڑی ذمہ داری پاکستان کے غیر دانشمند لیڈروں پر ہے۔ اس معاملہ کا غیر جانب دارانہ جائزہ جس نتیجہ تک پہنچاتا ہے وہ یہی ہے۔

آزادی کے بعد جب یہ مسئلہ پیدا ہوا، اس وقت مسٹر مہر چند مہاجن ریاست جموں و کشمیر کے وزیر اعظم تھے۔ وہ اس سے پہلے ہندستان کے چیف جسٹس رہ چکے تھے۔ انھوں نے اپنی خود نوشت سوانح عمری لوکنگ بیک (Looking back) میں تفصیل کے ساتھ کشمیر کا قصہ بیان کیا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۶۳ میں ایشیا پبلیشنگ ہاؤس (بمبئی) سے شائع ہوئی ہے۔

مسٹر مہر چند مہاجن لکھتے ہیں کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو مہاراجہ کشمیر نے انھیں ریاست کا وزیر اعظم مقرر کیا۔ کشمیر کے لئے روانگی سے پہلے وہ نئی دہلی میں مرکزی حکومت کے ذمہ داروں سے ملے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس وقت ہندستانی حکمراں ہندستان سے کشمیر کے الحاق کے بارے میں زیادہ سنجیدہ نہیں تھے۔ (صفحہ ۲۶۹) جسٹس مہر چند کے اس بیان کا جو مطلب ہے اس کو سمجھنا کوئی مشکل کام نہیں۔

اس سلسلہ میں دوسری شہادت جو پیش کرنا چاہتا ہوں وہ پاکستان کے سابق وزیر اعظم چودھری محمد علی کی ہے۔ ان کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے ظہور پاکستان (Emergence of Pakistan) اس کتاب میں انھوں نے کشمیر کے مسئلہ پر تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ۱۹۴۸ میں جب انڈیا نے ریاست جوناگڑھ میں اپنی فوجیں داخل کر دیں اور اس کو انڈیا کے

ساتھ ملالیا تو پاکستانی حکومت کی درخواست پر نئی دہلی میں ایک خصوصی میٹنگ ہوئی۔ اس میں ہندستان کی طرف سے پنڈت جواہر لال نہرو اور سردار پٹیل شریک تھے۔ پاکستان کی طرف سے نواب زادہ لیاقت علی خاں اور مصنف کتاب چودھری محمد علی نے شرکت کی۔

چودھری محمد علی بتاتے ہیں کہ میٹنگ شروع ہوئی تو لیاقت علی خان (وزیراعظم پاکستان) نے اس پر تقریر شروع کی کہ انڈیا نے ریاست جونا گڈھ میں اپنی فوجیں کیوں داخل کیں جب کہ اس نے پاکستان سے الحاق کر لیا تھا۔ ان کی لمبی تقریر پر سردار پٹیل صبر نہ کر سکے اور درمیان میں بول اٹھے۔ چودھری محمد علی کے بیان کے مطابق، سردار پٹیل اگرچہ متعصب تھے مگر وہ حقیقت پسند (realistic) تھے۔ چنانچہ اس موقع پر انھوں نے کہا کہ جونا گڈھ کی بات چھوڑو، کشمیر اور حیدر آباد کی بات کرو۔ اور ہم بآسانی دونوں کے بارے میں ایک اگریمنٹ تک پہنچ سکتے ہیں۔

Why do you compare Junagarh with Kshmir ? Talk of Hyderabad and Kashmir, and we could reach an agreement (p 300)

مگر چودھری محمد علی کے بیان کے مطابق وزیر اعظم پاکستان نے سرادار پٹیل کی اس پیشکش پر کوئی دھیان نہیں دیا اور گفتگو بے نتیجہ طور پر ختم ہو گئی۔

اس تاریخی شہادت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کشمیر کا مسئلہ ابتداءً اتنا سادہ تھا کہ وہ بات چیت کی میز پر حل ہو رہا تھا۔ اس کے باوجود پاکستانی لیڈر کیوں اس کو حل کرنے میں ناکام رہے۔ اس کی وجہ پاکستان کے قائدین کی سیاسی حرص تھی۔ وہ عجیب وغریب طور پر اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ وہ حیدر آباد اور کشمیر دونوں کو پاکستان میں شامل کر لیں گے۔ حیدر آباد کو اس منطق سے کہ اس کا صدر ریاست مسلمان ہے۔ اور کشمیر کو اس منطق سے کہ اس کی آبادی میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ یہ ڈبل منطق یقینی طور پر ناقابل عمل تھی۔ چنانچہ اس معاملہ میں پاکستانی قائدین کا انجام وہی ہوا جس کو ایک جاپانی مثل میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ـــــ جو آدمی بیک وقت دو خرگوشوں کے پیچھے دوڑے وہ ایک کو بھی پکڑ نہیں سکتا۔

14

میرے والد فرید الدین خاں مرحوم اپنے علاقے کے بڑے زمیں دار تھے۔ ان کا انتقال

۱۹۲۹ میں ہوا۔ وہ نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ ہندوؤں میں بھی اتنا زیادہ مقبول تھے کہ لوگ اپنے جھگڑوں کو طے کرنے کے لئے ان کے پاس آیا کرتے تھے۔ معاملہ کو سننے کے بعد وہ جو فیصلہ دے دیتے اس کو دونوں فریق بلا بحث مان لیتے۔ اس علاقہ میں ہندوؤں کی اکثریت تھی مگر میرے والد کی نسبت سے کبھی کوئی فرقہ وارانہ مسئلہ پیدا نہیں ہوا۔

والد صاحب ایک مثالی قسم کے نیک نفس اور فیاض آدمی تھے۔ علاقہ کے ہر شخص کی خاموش مدد کرتے رہتے تھے۔ مثلاً کسی شخص کا گھر بن رہا ہے اور اس کو لکڑی کی ضرورت ہے تو کہتے کہ جاؤ فلاں درخت سے اپنی ضرورت کے مطابق لکڑی کاٹ لو۔ اسی طرح اگر کسی شخص کی شادی ہے اور اس کو غلہ کی ضرورت ہے تو اس سے کہہ دیتے کہ تم کو جتنے چاول اور دال کی ضرورت ہے ہمارے یہاں سے لے جاؤ۔ ایک مرتبہ ہمارے دروازہ سے ہندوؤں کی ایک بارات گذری اس وقت رات ہو گئی تھی اور اندھیرا چھا گیا تھا۔ والد صاحب نے کہا کہ اندھیرے میں آپ لوگ کہاں جائیں گے۔ رات کو ہمارے یہاں ٹھہریئے اور صبح کو چلے جایئے۔ اس کے بعد پوری بارات کو ٹھہرا کر سب کے لئے کھانے پینے اور سونے کا انتظام کیا۔

جھگڑوں کو طے کرنے کے لئے ان کا طریقہ بڑا عجیب تھا۔ ہمارے گاؤں کے ایک طرف ہریجنوں کا محلہ تھا۔ ایک دن دو ہریجن خاندان آپس میں لڑ گئے۔ جھگڑا ہوتا رہا یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ شام کو وہ لوگ اپنا جھگڑا طے کرنے کے لئے والد صاحب کے پاس آئے والد صاحب نے کہا کہ جب دن بھر تم جھگڑتے رہے تو تم نے کچھ کھایا پیا بھی نہیں ہو گا۔ پہلے کھاؤ پیو اس کے بعد جھگڑا طے کیا جائے گا۔ یہ کہہ کر ان کو راشن اور لکڑی دی اور کہا کہ تم لوگ اپنا کھانا پکاؤ اور سیر ہو کر کھاؤ۔ جب وہ لوگ کھا پی کر فارغ ہوئے تو جھگڑا اپنے آپ ختم ہو چکا تھا۔ اس کے بعد وہ لوگ خوش ہو کر اپنے گھر واپس چلے گئے۔

یہ وہ ماحول ہے جو ہمارے ملک میں ۱۹ویں صدی کے آخر اور ۲۰ویں صدی کے آغاز میں پایا جاتا تھا۔ اس وقت نہ صرف میرے والد صاحب بلکہ عام طور پر بستیوں کے بڑے لوگ اسی مزاج کے ہوا کرتے تھے۔ یہ ماحول مسلسل باقی رہا۔ حتی کہ ۱۹۴۷ کا انقلاب بھی اس ماحول کو برہم

نہ کر سکا۔ ۱۹۴۷ کے بعد کے واقعات میں سے ایک واقعہ یہاں بطور مثال نقل کیا جاتا ہے۔

میرے گاؤں میں ایک مسلمان زمیں دار تھے۔ وہ عمر میں مجھ سے چھوٹے تھے۔ ۱۹۹۴ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی بہادری نے ان کو غیر مصالحت پسند بنادیا تھا۔ ان کے پاس لائسنس یافتہ بندوق بھی تھی۔ جس کو وہ اکثر اپنے ساتھ رکھتے تھے۔

ہمارے گاؤں سے ملا ہوا ایک اور گاؤں ہے جس کو بکیہ کہا جاتا ہے۔ یہاں ایک راجپوت چھتر دھاری سنگھ رہتے تھے۔ مذکورہ مسلمان زمیں دار اور چھتر دھاری سنگھ کے درمیان مال یا جائداد کا کوئی جھگڑا نہ تھا۔ مگر غالباً دونوں میں انا کا ٹکراؤ ہوا اور باہم دشمنی قائم ہو گئی۔ غالباً ۱۹۶۶ کا واقعہ ہے۔ دونوں بذریعہ ٹرین شہر اعظم گڈھ جارہے تھے دونوں کی ملاقات ریلوے اسٹیشن (سنجر پور) میں ہوئی۔ یہاں کسی بات پر دونوں کے درمیان تکرار ہو گئی۔ مسلمان زمیں دار حسب معمول اپنی بندوق اپنے ساتھ لئے ہوئے تھے۔ انھوں نے جوش میں آکر بندوق اٹھائی اور بے تکلف چھتر دھاری سنگھ پر گولی چلادی۔ وہ فوراً ہی ہلاک ہو گئے۔

یہ خبر اچانک پورے علاقہ میں پھیل گئی۔ ہندو بہت بڑی تعداد میں چھتر دھاری سنگھ کے مکان کے پاس جمع ہو گئے۔ یہ ہندو غصہ میں بپھرے ہوئے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ فوراً ہمارے گاؤں میں پہنچیں اور نہ صرف مذکورہ مسلمان سے بلکہ پورے گاؤں سے اس کا انتقام لیں۔

ہندوؤں کی یہ مشتعل بھیڑ اگر اس وقت ہمارے گاؤں میں داخل ہوتی جو کہ بکیہ سے بمشکل ایک کیلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے تو یقیناً وہ لوگ پورے گاؤں کو آگ لگا دیتے۔ مگر عین اس وقت ایک غیر معمولی واقعہ ہوا مقتول چھتر دھاری سنگھ کا بھائی چتری سنگھ چٹان کی طرح ان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس نے کہا کہ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا ہم بدلہ ضرور لیں گے مگر سارے مسلمانوں سے نہیں بلکہ صرف اس قاتل مسلمان سے جس نے میرے بھائی کو قتل کیا ہے۔ ہمارا بدلہ بھی یہ نہیں ہوگا کہ ہم اس کے جواب میں قاتل مسلمان کو قتل کریں۔ ہم صرف یہ کریں گے کہ اس معاملہ کو عدالت میں لے جائیں گے اور وہاں قاتل مسلمان کو قانونی سزا دلوائیں گے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ مذکورہ مسلمان پر قتل کا مقدمہ چلا ان کو عدالت سے لمبی قید کی سزا دی گئی۔

یہ حال صرف ہمارے علاقہ کا نہیں تھا بلکہ پورے بر صغیر ہند میں ہندو اور مسلمان اسی طرح مل جل کر پر امن طور پر رہتے تھے۔ یہ ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے جس کو میری جیسی عمر کے لاکھوں لوگوں نے اس ملک میں اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس کا تجربہ کیا ہے۔ پھر سوال یہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان وہ تفریقی سیاست کیسے ابھری جس کا نتیجہ ملک کا بٹوارہ (۱۹۴۷) تھا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ملک کا بٹوارہ ہندوؤں اور مسلمانوں نے نہیں کروایا۔ بلکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے کچھ لیڈروں نے کروایا۔ یہ دو فرقوں کے عوام کا مسئلہ نہیں تھا بلکہ وہ کچھ لیڈروں کا مسئلہ تھا جنھوں نے عوام کے نام پر اپنی لیڈری کو فروغ دیا۔ ہندو اور مسلمان ابتداءً اپنی فطرت پر تھے۔ فطرت کی رہنمائی عین وہی ہوتی ہے جس کی ایک جھلک مذکورہ واقعات میں نظر آتی ہے۔ اس کے بعد اخبارت کا دور آیا اور اخبارات کے ساتھ قیادتیں ابھرنے لگیں۔ اب فطرت لوگوں کی رہنما نہ رہی بلکہ لیڈر ان کا رہنما بن گیا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے ہماری تمام سیاسی مصیبتوں کا آغاز ہوتا ہے۔

لیڈر یا قائد کون بنتا ہے، یہ وہ افراد ہیں جن کے اندر عام لوگوں سے زیادہ ذہانت پائی جاتی ہو۔ اور یہ تجربہ ہے کہ جو آدمی زیادہ باصلاحیت اور زیادہ ذہین ہو وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر انانیت پسند (egoist) بن جاتا ہے۔ چنانچہ ہر بڑا لیڈر لازمی طور پر انانیت پسند ہوتا ہے۔ بر صغیر ہند کے لیڈروں میں اس اعتبار سے غالباً صرف ایک قابل ذکر استثنا نظر آتا ہے اور وہ مہاتما گاندھی کا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اکثر قومی المیے صرف ایک سبب سے پیدا ہوئے۔ اور وہ دو لیڈروں کے درمیان انا کا ٹکراؤ (ego clash) ہے۔ مثال کے طور پر ۱۹۷۱ میں مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کا ٹوٹ کر دو ٹکڑے ہو جانا زیادہ تر ذوالفقار علی بھٹو اور شیخ مجیب الرحمٰن کے درمیان اسی انا کے ٹکراؤ کا نتیجہ تھا۔ اسی طرح کشمیر کا مسئلہ بروقت طے نہ ہونے کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ شیخ محمد عبداللہ اور مسٹر محمد علی جناح کے درمیان انا کا ٹکراؤ پیش آگیا وغیرہ۔

اس حیثیت سے بر صغیر ہند کی سیاست کا مطالعہ نہایت عبرت انگیز ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ملک کا بٹوارہ ہندو مسلم عوام نے نہیں کیا بلکہ ہندو مسلم عوام کے نام پر ہندو مسلم لیڈروں نے کیا۔ یہ لیڈر اپنی انا کے خول کے باہر نہ آسکے یہاں تک کہ ان کی انانیت پسندی کی قیمت ملک کو نہایت مہنگی صورت میں دینی پڑی۔

جب بھی کچھ آدمی مل جل کر رہیں گے تو ان کے درمیان لازمی طور پر کچھ ناخوشگوار واقعات پیش آئیں گے، ایک فرقہ اور دوسرے فرقہ میں بھی اور خود ایک فرقہ کے اندر بھی۔ اس قسم کی ناخوشگوار صورت حال سے بچنا سرے سے ممکن ہی نہیں۔ ایسی حالت میں سماج کے اندر اتحاد قائم رکھنے کا راز کیا ہے وہ صرف ایک ہے، اور وہ اعراض (avoidance) اور ٹالرنس ہے۔ ناخوشگوار صورت حال پیدا ہونے پر اگر اعراض کا انداز اختیار کیا جائے تو اتحاد باقی رہے گا اور اگر اعراض نہ کیا جائے تو لوگوں کی انانیت بھڑکے گی اور پورا سماج اختلاف اور انتشار کا شکار ہو کر رہ جائے گا۔

اس سلسلہ کی ایک علامتی مثال یہ ہے کہ مسٹر محمد علی جناح انگلینڈ جانے سے پہلے تک کانگریس میں شامل تھے ایک بار ایسا ہوا کہ کانگریس کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا۔ مہاتما گاندھی اور دوسرے لیڈروں کے ساتھ مسٹر محمد علی جناح بھی اسٹیج پر موجود تھے۔ اپنی باری پر وہ تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوئے تو عام مزاج کے مطابق، انھوں نے اپنی تقریر کا آغاز اسٹیج پر بیٹھی ہوئی ممتاز شخصیتوں کے نام سے کرنا چاہا۔ چنانچہ انھوں نے کہا: مسٹر گاندھی۔

یہ سن کر بعض کانگریسی بگڑ گئے۔ انھوں نے کہا کہ مہاتما گاندھی کہو، ہم مسٹر گاندھی نہیں سن سکتے۔ جناح صاحب ایک لمحہ کے لئے رکے۔ اس کے بعد انھوں نے دوبارہ تقریر شروع کی تو پھر یہی کہا کہ مسٹر گاندھی۔ اب مذکورہ کانگریسی دوبارہ اپنی مانگ لے کر کھڑے ہو گئے۔ اور انھوں نے کہا کہ مہاتما گاندھی کہو۔ اس کے بعد جناح صاحب نے اپنی تقریر روک دی۔ وہ خاموشی کے ساتھ اسٹیج سے اترے اور اپنے گھر واپس آگئے۔

یہ بحران نہایت آسانی کے ساتھ ٹل سکتا تھا۔ اس کی صورت یہ تھی کہ مہاتما گاندھی

کھڑے ہو کر کہتے کہ جناح صاحب مجھ سے سینئر ہیں۔ ان کو حق ہے کہ وہ مجھ کو مسٹر گاندھی کے لفظ سے خطاب کریں۔ اگر مہاتما گاندھی بر وقت ایسا کرتے تو یہ تعطل فوراً ختم ہو جاتا۔ اور اجلاس کی کارروائی معمول کے مطابق جاری ہو جاتی۔

مگر ایسا نہیں ہوا۔ مسٹر محمد علی جناح اس واقعہ کے جلد ہی بعد لندن چلے گئے۔ کچھ عرصہ بعد وہ واپس آئے۔ اب انھوں نے کانگریس کو چھوڑ کر مسلم لیگ میں شرکت کرلی۔ جلد ہی وہ مسلم لیگ کے سب سے بڑے قائد بن گئے۔

یہ بلاشبہ ایگو کا مسئلہ تھا۔ جناح صاحب اگر رعایت کا انداز اختیار کرتے تو وہ دوسری بار مہاتما گاندھی کہہ سکتے تھے مگر جب آدمی کی انا بھڑک اٹھے تو اس کے بعد اس کے اندر سے رعایت کا ذہن ختم ہو جاتا ہے۔ وہ معاملہ کو اپنے وقار کا معاملہ بنالیتا ہے۔ اور جہاں وقار کی نفسیات بھڑک اٹھے وہاں وہی ہوتا جو عملاً ہماری تاریخ میں پیش آیا۔ (اس سلسلہ میں مہاتما گاندھی کا رویہ قابل تعریف ہے۔ چنانچہ انھوں نے جناح صاحب کو خط لکھا تو لوگوں کے اختلاف کے باوجود انھوں نے جناح صاحب کو قائداعظم کے لفظ سے خطاب کیا)

اسی انانیت کی ایک مثال وہ ہے جو پنڈت جواہر لال نہرو کے یہاں پائی جاتی ہے اس مثال کو مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی کتاب آزادیٔ ہند (India Wins Freedom) میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ۱۹۳۶ کے الیکشن میں ایک معاہدہ کے تحت مسلم لیگ نے کانگریس کی حمایت کی تھی۔ اس معاہدہ کا ایک جزء یہ تھا کہ یوپی کیبنٹ میں جو مسلمان وزیر بنایا جائے گا وہ مسلم لیگ کا آدمی ہو گا۔ الیکشن میں کانگریس کو بھاری جیت ہوئی اس وقت جواہر لال نہرو کانگریس کے صدر تھے۔ انہوں نے فتح کے جوش میں یہ اعلان کر دیا کہ یوپی میں ہم خود اپنی پسند کی وزارت بنائیں گے۔ مسلم لیگ کا کوئی آدمی ہم اس میں شامل نہیں کریں گے۔ اس اعلان کے بعد سنجیدہ لوگوں نے جواہر لال نہرو کو سمجھانے کی کوشش کی مگر مذکورہ اعلان کے بعد وہ ان کے لئے وقار کا مسئلہ بن گیا۔ چنانچہ وہ اپنے اعلان سے پھرنے پر راضی نہ ہوئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم لیگ

کے نمائندہ عبدالرب نشتر کے بجائے کانگریس کے نمائندہ حافظ محمد ابراہیم کو یوپی وزارت میں مسلمان کی سیٹ دی گئی۔

جیسا کہ معلوم ہے ۱۹۳۶ میں کانگریس اور مسلم لیگ ایک دوسرے کے قریب آچکے تھے اور بظاہر بٹوارہ کا معاملہ ٹل گیا تھا مگر جواہر لال نہرو کی خودرائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم لیگی لیڈر بھڑک اٹھے۔ وہ دوبارہ کانگریس سے دور ہو گئے یہاں تک کہ ملک دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔

حدیث میں آیا ہے کہ ہر پیدا ہونے والا فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی اور مجوسی اور نصرانی بنادیتے ہیں (صحیح البخاری، کتاب الجنائز) اس بات کو توسیع دیتے ہوئے میں کہوں گا کہ عام انسان ہمیشہ صحیح فطرت پر ہوتے ہیں۔ پھر ان کے لیڈر ان کو بہکا کر غیر فطری راستوں پر ڈال دیتے ہیں۔

بر صغیر ہند کے مسلمانوں اور ہندوؤں میں اگر وہ لیڈر نہ ابھرتے جن کا نام بدقسمتی سے ملک کی تاریخ میں ہیرو کے طور پر لکھا ہوا ہے تو یقینی طور پر ملک کا نقشہ آج سے بہت زیادہ بہتر ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر مسٹر لیڈر مسٹر ایگو ہوتا ہے، اور ہر مسٹر ایگو یہ کرتا ہے کہ اپنی ذات کی خاطر وہ پوری قوم کو داؤ پر چڑھا دیتا ہے۔ جس سماج میں اس قسم کے لیڈر موجود نہ ہوں وہاں خدا کی پیدا کی ہوئی فطرت لوگوں کی رہنما ہوگی اور فطرت بلاشبہ صحیح ترین رہنما ہے۔ وہ رہنمائی میں کبھی غلطی نہیں کرتی۔

15

انڈیا میں ہندو اور مسلمان کے درمیان جو مسئلہ ہے اس کا بڑا سبب سیاسی تاریخ ہے۔ یہ زیادہ تر مسلم حکمرانوں کی وراثت ہے جس کو بعد کی مسلم نسلیں بھگت رہی ہیں۔ اس کا ایک واضح ثبوت یہ ہے کہ فرقہ وارانہ کشیدگی کی یہ صورت حال زیادہ تر شمالی ہند میں ہے، جنوبی ہند کا علاقہ اس برائی سے اب تک پاک رہا ہے۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ مسلم حکمرانوں اور ہندو راجاؤں کے درمیان لڑائیاں زیادہ تر شمالی ہند میں ہوئیں۔ جنوبی ہند کا علاقہ بڑی حد تک اس قسم کی خونیں داستانوں سے محفوظ رہا۔

ہندوؤں کی باتیں سننے یاان کی کتابیں پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں انھیں سب سے زیادہ شکایت مسلم حکمرانوں سے ہے، خاص طور پر اورنگ زیب سے۔ مثلاً ان حکمرانوں کا یہ فعل کہ انھوں نے اپنے دور حکومت میں کئی مندروں کو توڑااوراس کی جگہ مسجدیں بنائیں۔ جہاں تک اس الزام کی تاریخی حیثیت کا تعلق ہے، تواس سے انکار کرنا مشکل ہے۔ یہاں میں اس سلسلہ میں صرف ایک حوالہ دیتاہوں۔

مولاناسید ابوالحسن علی ندوی کے والد محترم مولانا حکیم سید عبدالحی کی ایک کتاب ہے۔ یہ کتاب مجلس تحقیقات ونشریات اسلام (ندوہ لکھنؤ) سے ۱۹۷۳ میں شائع کی گئی ہے اس کتاب کا نام یہ ہے "ہندوستان اسلامی عہد میں" اس کتاب کے ساتھ مولاناابوالحسن علی ندوی کا ایک مبسوط مقدمہ شامل ہے۔ مولانا نے اپنے اس مقدمہ میں مذکورہ کتاب کو مسلم عہد کے ہندستان کی صحیح تصویراور مکمل دستاویز قرار دیاہے (صفحہ ۱۷)

اس کتاب میں، بابری مسجد سمیت کئی مسجدوں کے بارے میں بتایا گیاہے کہ وہ مندروں کو توڑ کر عین اسی جگہ بنائی گئیں۔ مثلاً بابری مسجد کی بابت اس کتاب میں یہ الفاظ درج ہیں: کہاجاتا ہے کہ سیتاکا یہاں ایک مندر تھا، جہاں وہ رہتیں، اور اپنے شوہر کے لئے کھانا پکاتی تھیں، اسی جگہ بابر نے ۹۲۳ھ میں یہ مسجد تعمیر کی (صفحہ ۱۴۱)

اس کتاب میں اس طرح کی متعدد مسجدوں کا تذکرہ ہے جو ہندو عبادت گاہوں کی جگہ بنائی گئیں مثلاً "عالمگیری مسجدیں" کے زیر عنوان بتایا گیا ہے: کہاجاتا ہے کہ بنارس کی مسجد عالمگیر نے بنارس کے بشیشور مندر کی جگہ بنائی تھی۔ وہ مندر بہت بلند اور ہندوؤں میں مقدس تھا، اس نے اس کی جگہ انہی پتھروں سے بلند مسجد تعمیر کی، اور اس کے قدیم پتھر کو دیواروں میں معکوس کر کے نصب کر دیئے۔ (صفحہ ۱۴۶)

اس قسم کے واقعات جو مغل عہد میں پیش آئے ان کے بارے میں ہندو مصنفین اور مسلم مصنفین دونوں عام طور پر غیر منصفانہ انداز اختیار کرتے ہیں۔ ہندو مصنفین عام طور پر ان واقعات میں اضافہ کر کے ان کو مزید سنسنی خیز انداز میں پیش کرتے ہیں۔ دوسری طرف مسلم مصنفین یا تو

ان کو گھٹا کر پیش کرتے ہیں یا سرے سے ان کی واقعیت کا انکار کر دیتے ہیں۔ مگر یہ دونوں ہی طریقے اس معاملہ میں غیر مفید ہیں۔

اس معاملہ کے تصفیہ کے لئے کوئی سنجیدہ کوشش نہ ۱۹۴۷ سے پہلے کی گئی اور نہ ۱۹۴۷ کے بعد۔ ضرورت تھی کہ اس مسئلہ پر ایک مستقل کمیشن بنایا جاتا جو ہندو مورخین اور مسلم مورخین پر مشتمل ہوتا۔ وہ اس قسم کی نزاعی عبادت گاہوں کا جائزہ لے کر باضابطہ رپوٹ پیش کرتا اور قانون اور شریعت کی روشنی میں اس کا حل بتاتا۔ اس کے بعد ہندو اور مسلمان دونوں طرف کے ذمہ داروں کے دستخط سے ایک معاہدہ کیا جاتا اور آربٹریشن ایکٹ کے تحت اس پر عدالتی تصدیق حاصل کرلی جاتی۔ اس طرح یہ مسئلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو سکتا تھا۔ مگر بدقسمتی سے اس نوعیت کی کوئی موثر کوشش اس معاملہ میں نہ کی جاسکی۔

16

۱۹۴۷ میں جب ہندستان ایک آزاد ملک بنا، اس وقت ملک کے باشندوں کی تعداد ۳۶ کرور تھی اس وقت وزیر اعظم پنڈت جوہر لال نہرو نے کہا کہ ہندستان کا ہر آدمی ایک مسئلہ ہے، اس طرح ہندستان ۳۶ کرور مسائل سے دوچار ہے، پنڈت نہرو نے یہاں کے باشندوں کو مسائل کے روپ میں دیکھا۔ اس لئے ان کے بارے میں وہ صحیح منصوبہ بندی نہ کر سکے۔ اگر وہ ان باشندوں کو اثاثہ (asset) کے روپ میں دیکھتے تو ان کی منصوبہ بندی بالکل مختلف ہوتی۔

ہندستانی باشندوں کو اثاثہ کے روپ میں دیکھنے کے بعد ان کے اندر یہ سوچ ابھرتی کہ ملک میں ایسے اسباب پیدا کئے جائیں کہ یہ لوگ اس میں اپنا استعمال پاسکیں۔ ہر انسان پیدائشی طور پر ایک ہیرو ہوتا ہے لیکن اس کو اپنے ہیروانا کردار کو ادا کرنے کے لئے موافق خارجی اسباب کی ضرورت پڑتی ہے۔ اگر اس قسم کے خارجی اسباب حاصل ہوں تو ہر آدمی اس کے اندر عمل کر کے ہیرو بن جائے گا۔ اور اگر موافق اسباب نہ ملیں تو یہی انسان زیرو کے روپ میں دکھائی دینے لگے گا۔

اس معاملہ کی ایک عملی مثال خود ہندوستانی باشندوں کی صورت میں موجود ہے۔ یہ لوگ

جب اپنے ملک میں ہوتے ہیں تو عام طور پر وہ کوئی بڑا کام نہیں کرپاتے۔ لیکن جب یہی لوگ امریکہ اور یورپ کے ترقی یافتہ ملکوں میں جاتے ہیں تو اچانک وہاں وہ ہیرو کی طرح کام کرنے لگتے ہیں۔

مثال کے طور پر ہر گوند کھورانا جب ہندستان میں تھے تو یہاں وہ کوئی کارنامہ انجام نہ دے سکے۔ انھوں نے دلی یونیورسیٹی میں لیکچر شپ کے لئے درخواست دی مگر وہ یونیورسیٹی میں اس عہدہ کے لئے نااہل سمجھے گئے۔ اس کے بعد مسٹر کھورانا امریکہ چلے گئے۔ وہاں انھیں ہر قسم کے علمی اور سائنسی مواقع ملے جس میں وہ اپنی صلاحیتوں کا استعمال پا سکیں۔ اب انھوں نے محنت شروع کردی۔ اس کے بعد یہی ہر گوند کھورانا ممتاز سائنسی پروفیسر بن گئے۔ اور آخر کار اپنی غیر معمولی تحقیقات کے نتیجہ میں انھیں نوبل انعام سے سرفراز کیا گیا۔

میں نے اپنے بیرونی سفروں کے درمیان کئی ہندستانیوں سے پوچھا کہ آپ لوگ باہر آکر جس محنت اور لگن کے ساتھ کام کرتے ہیں اسی محنت اور لگن کے ساتھ انڈیا میں کام کریں تو وہاں بھی آپ بڑی بڑی ترقیاں حاصل کر سکتے ہیں۔ ان ہندستانیوں میں سے تقریباً ہر ایک نے میری رائے سے اتفاق کیا۔ مگر انھوں نے کہا کہ انڈیا میں اور ان ترقی یافتہ ملکوں میں ایک بہت بڑا فرق ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ یہاں جب ہم کوئی کام کرنا چاہتے ہیں تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہر طرف ہمارے لئے راستے کھلے ہوئے ہیں۔ ایک طرف یہ کہ جب ہم اپنا کوئی منصوبہ لے کر اٹھتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی تکمیل کے تمام ضروری اسباب بہترین طور پر یہاں موجود ہیں۔ دوسری طرف یہ کہ یہاں جب ہم محنت کرتے ہیں اور اپنی صلاحیتوں کو لگاتے ہیں تو ہم کو یقین ہوتا ہے کہ ہمیں اس کی پوری قیمت ملے گی۔ جب کہ انڈیا میں ان دونوں میں سے کوئی بھی چیز موجود نہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ اپنے وطن میں اگر یہ دونوں چیزیں ہمیں مل جائیں تو شاید ہم میں سے کوئی بھی شخص بدیش میں رہنا پسند نہ کرے۔

پانی کے بہاؤ کے لئے پانی کو دھکیلنا نہیں پڑتا۔ پانی اپنے آپ بہتا ہے اگر آپ پانی کو جاری کرنا چاہیں تو صرف یہ کیجئے کہ اس کے لئے راستہ بنا دیجئے۔ اس کے بعد پانی اپنے آپ بہنے لگے گا۔

یہی معاملہ انسان کا بھی ہے۔ انسان خود اپنی فطرت کے مطابق، ترقی کی طرف دوڑنا چاہتا ہے۔ اگر اس کو نظر آئے کہ یہاں میرے لئے مواقع موجود ہیں تو وہ اپنے آپ ترقی کی منزل کی طرف رواں دواں ہو جائے گا۔

آزادی کے بعد ہمارے سیاسی لیڈروں کو صرف یہ کرنا تھا کہ وہ ملک میں ترقیاتی سرگرمیوں کے لئے وہ اسباب مہیا کریں جن کو موجودہ زمانہ میں انفراسٹرکچر کہا جاتا ہے---ملک میں وقت کے معیار کے مطابق اچھی سڑکیں بنائیں۔ بجلی اور ٹیلی فون کا عمدہ نظام قائم کریں، ہر بستی میں ٹرانسپورٹ کی قابل اعتماد سہولتیں مہیا کریں۔ ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک کے لئے اچھے ادارے بنائیں۔ ہر جگہ معیاری لائبریریاں قائم کریں۔ دیہاتوں میں بھی کام کی وہی سہولتیں مہیا کریں جو شہروں میں پائی جاتی ہیں، وغیرہ۔

اسی کے ساتھ ان کو یہ کرنا تھا کہ وہ ملک میں ایسی انتظامیہ (ایڈمنسٹریشن) قائم کریں جہاں رشوت اور بدعنوانی کے بغیر ہر کام ہو سکے۔ ہر شہری کو یہ یقین ہو کہ وہ ایک ایسے نظام کے تحت جی رہا ہے جہاں اس کا جائز حق اس کو ملے گا، اس کا حق کبھی مارا نہیں جائے گا۔ ہر ایک کو پیشگی طور پر یہ اطمینان حاصل ہو کہ اگر اس نے اہلیت اور قابلیت کا ثبوت دیا تو ضرور وہ اس کی قیمت پائے گا۔ ہر ایک کو یہ اعتماد ہو کہ اگر اس کے ساتھ کوئی بے انصافی ہوئی تو وہ عدالت میں جاکر وہاں سے بھرپور انصاف حاصل کر سکتا ہے۔ ہر ایک پیشگی طور پر یہ یقین رکھتا ہو کہ میں ایک ایسے نظام کے تحت جی رہا ہوں جس میں ہر ایک برابر کی حیثیت رکھتا ہے، عزت کے اعتبار سے بھی اور حقوق کے اعتبار سے بھی۔ بمبئی کے ایک تاجر مہیش بھائی شاہ نے بجا طور پر کہا: سرکار کا کام دھندا کرنا نہیں ہے، سرکار کا کام دھندا کرنے والوں کو اوسر مہیا کرنا ہے۔

اس قسم کا نظام کوئی یوٹوپیا نہیں، وہ عملاً آج بھی ان ملکوں میں قائم ہے جن کو ترقی یافتہ ملک کہا جاتا ہے۔ یہی وہ اصل کشش ہے جو لاکھوں ہندستانیوں کو مجبور کر رہی ہے کہ وہ اپنا وطن چھوڑ کر ان بدیشی ملکوں میں چلے جائیں۔ آزادی کے بعد ہمارے حکمرانوں کا اصل کام یہی تھا کہ وہ انڈیا کو اسی قسم کے مواقع اور انفراسٹرکچر والا ملک بنائیں۔

اس کے بعد ہمارے حکمراں دیکھتے کہ وہ کروڑوں ہندستانی جن کو انھوں نے بطور خود مسئلہ فرض کر رکھا ہے وہ ملک کے لئے قیمتی اثاثہ اور سرمایہ ہیں۔ مگر ملک کی آزادی کے بعد ہمارے حکمرانوں نے قیمتی پچاس سال بے فائدہ سرگرمیوں میں کھودیئے۔ مثلاً نان الائنڈ موومنٹ کھڑی کرنا، پبلک سیکٹر بنانا، مالیاتی اداروں کو نیشنلائز کرنا، قوانین میں اضافہ کرنا وغیرہ۔ وہ اسی قسم کی بے فائدہ سرگرمیوں میں مشغول رہے۔ اور آخر کار ہمارے حصہ میں ایک برباد ملک کے سوا اور کچھ نہ آیا۔

۱۸ ستمبر ۱۹۹۸ کو ایک صاحب سے گفتگو ہوئی۔ وہ دہلی کے ایک بزنس گروپ میں بڑے افسر ہیں۔ انہوں نے گفتگو کے دوران کہا کہ ہندستان پچھلے پچاس سال میں بہت زیادہ ترقی کر چکا ہوتا مگر ایک چیز نے اس کی ترقی کو روک دیا اور وہ سرکاری قانون قاعدے کی بھرمار ہے۔ ہم لوگ جو بزنس کرتے ہیں، ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ ہم کوئی بھی چھوٹا یا بڑا کام سرکار کی منظوری کے بغیر نہیں کر سکتے، حتی کہ لبرلائزیشن کے بعد بھی نہیں۔

انھوں نے کہا کہ نہرو کے زمانہ میں جو سوشلسٹ اسکیم چلائی گئی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر کام میں سرکاری افسروں اور سرکاری اداروں کا دخل ہو گیا۔ جو لوگ ان دفتروں میں قلم لئے ہوئے بیٹھے تھے انھوں نے محسوس کیا کہ ان کے دستخط کے بغیر کوئی بڑے سے بڑا آدمی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی منظوری کی قیمت وصول کرنا شروع کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہو کہ سارا سماج رشوت کا جنگل بن گیا۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں ملک ترقی نہیں کر سکتا۔

میں نے کہا کہ ہمارے ملک میں گاندھی اور نہرو کو سب سے اونچا درجہ حاصل ہے مگر میرے نزدیک یہی دونوں شخصیتیں ہیں جنھوں نے ملک کی آزادی کو بربادی میں تبدیل کر دیا ہے۔ گاندھی کا عدم تشدد کا ہتھیار عملاً ملک میں لاقانونیت کو فروغ دینے کا سبب بنا اور نہرو کے سرکاری کنٹرول نے سارے ملک کو رشوت اور بدعنوانی کی جال میں اس طرح پھنسا دیا کہ اب بظاہر اس سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔

تقسیم (۱۹۴۷) کے بعد سرحد کے دونوں طرف ملک کی تعمیر نو کے نام پر دو مختلف تحریکیں چلائی گئیں۔ ہندستان میں اس تحریک کا عنوان تھا: سوشلسٹک پیٹرن آف سوسائٹی۔ اور پاکستان میں اس تحریک کا عنوان تھا: اسلامک پیٹرن آف سوسائٹی۔ نام کے اعتبار سے دونوں تحریکیں بظاہر ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔ مگر نتیجہ کے اعتبار سے دونوں کا انجام ایک ہوا۔ اور وہ یہ کہ دونوں ہی تحریکیں کسی تعمیری انجام تک نہ پہنچ سکیں۔

جنوری ۱۹۵۵ میں آوڈی (مدراس) میں کانگریس کا ڈائمنڈ جوبلی سشن ہوا۔ اس سشن میں اس وقت کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی قیادت میں متفقہ طور پر یہ رزولیوشن پاس ہوا کہ ہندستان میں سوشلسٹ طرز کا سماج بنایا جائے گا۔

میں اول دن سے اس نظریہ کا مخالف تھا۔ میں نے اس کے بعد ہی اس موضوع پر ایک کتاب کی تیاری شروع کر دی۔ سوشلزم اور مارکسزم کو سمجھنے کے لئے میں نے دس ہزار سے زیادہ صفحات پڑھے۔ اس کے بعد میں نے وہ کتاب لکھی جو پہلی بار اپریل ۱۹۵۹ میں چھپی۔ اس کتاب کا نام تھا۔ مارکسزم تاریخ جس کو رد کر چکی ہے:

Marxism a rejected idealogy

پنڈت جواہر لال نہرو اس وقت پورے ملک کے واحد سب سے بڑے لیڈر تھے۔ انھوں نے اپنی پوری طاقت اس تجویز کو زیر عمل لانے میں لگا دی۔ پانچ سالہ منصوبے وضع کئے گئے۔ پبلک سکٹر (صحیح تر لفظ میں گورنمنٹ سکٹر) کے نام سے دیو پیکر صنعتی ادارے قائم ہوئے۔ ہزاروں کی تعداد میں ایکٹ اور ضابطے بنائے گئے۔ یوجنا بھون اور وکاس بھون جیسے ناموں سے بہت سی ہمالیائی عمارتیں کھڑی کی گئیں۔ ملک کی پوری اقتصادیات کو براہ راست یا بالواسطہ طور پر گورنمنٹ کے کنٹرول میں لے لیا گیا۔ ان سارے رومانوی منصوبوں کو وقوع میں لانے کے لئے ملک کے اوپر بھاری ٹیکس لاد دیئے گئے۔ اس نام نہاد "سوشلسٹ ماڈل" کے اوپر ملک ۴۰ سال سے زیادہ مدت تک چلتا رہا۔

مگر اس انتہائی مہنگے منصوبے کا جو نتیجہ نکلا اس کو سی راج گوپال اچاری نے لائسنس پرمٹ

راج کا نام دیا تھا۔ تاہم راج گوپال اچاری (وفات 1972) یہ دیکھنے کے لئے زندہ نہ رہے کہ نہرو کا لائسنس پرمٹ راج مزید ترقی کر کے لیتھارجی اور کرپشن کا راج بن گیا۔ نام نہاد نیشنلائزیشن کے نظام نے لوگوں کو عمومی طور پر کاہل بنادیا۔ زندگی کے تمام شعبوں کو سرکاری آدمیوں کے ہاتھ میں دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر طرف نا قابل بیان حد تک رشوت اور کرپشن کا بازار گرم ہو گیا۔

نہرو کے سوشلسٹ نظام نے ملک میں بے شمار کلرکوں کی ایک فوج بنائی اور پھر قوم کو کلرکوں کی اس بے رحم فوج کے حوالہ کر دیا۔ نئے نظام کے تحت ان کو اتنے اختیارات حاصل تھے کہ ہر کلرک گویا کہ ایک گورنر تھا۔

اس سوشلسٹ نظام نے ملک کو طرح طرح کے مہلک نقصان پہنچائے۔ مثلاً اس نظام کے نتیجہ میں ٹریڈ یونین جیسی تحریکیں وجود میں آئیں جنھوں نے پورے کارکن طبقہ کو اور آخر کار پورے سماج کو ڈیوٹی کے بجائے حقوق پر نظر رکھنے والا بنادیا۔ اس طرح ملکی صنعت کی ترقی کے نام پر اس کو غیر فطری تحفظ دیا گیا۔ اس کے نتیجہ میں ملک کا مارکیٹ غیر معیاری سامانوں سے بھر گیا۔

اس سے بھی زیادہ بڑا نقصان یہ ہوا کہ اسمگلنگ کا جال سارے ملک میں پھیل گیا۔ حوالہ سسٹم کی صورت میں کرنسی کی ایک ایسی غیر قانونی تجارت وجود میں آگئی جو قانونی مالیاتی اداروں کے حجم سے بھی زیادہ بڑی تھی اس کے نتیجہ میں کھربوں کی بیرونی کرنسی ملک میں داخل ہوئے بغیر باہر ہی باہر فرخت ہو گئی۔

۲ جولائی ۱۹۹۸ کو حبیب محمد صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ حیدر آباد کے ایک تاجر ہیں۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ میں ایک صنعتی ادارہ چلاتا ہوں۔ اس کو چلانے کے لئے مجھے تقریباً ۴۵ سرکاری کھڑکیوں (windows) پر کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ ان میں سے ہر ونڈو کو مجھے پر سیکیوٹ کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ اس صورت حال نے مجھے اتنا پریشان کیا کہ اب میں نے اپنا کاروبار تقریباً ختم کر دیا ہے۔

اس کے بعد انھوں نے کہا کہ حال میں میں امریکہ گیا تھا۔ وہاں میں ایک مہینہ رہ کر واپس آیا ہوں۔ وہاں میں نے دیکھا کہ حکومت نے اپنے شہریوں کو ہر قسم کی سہولت دے رکھی ہے آپ

کو کسی سرکاری ونڈو پر لائن لگانے کی ضرورت نہیں۔ وہاں کھلا مقابلہ ہے وہاں آپ کو صرف ایک کام کرنا ہے۔ مقابلہ میں اپنے آپ کو اہل ثابت کیجئے اور جتنی چاہے ترقی کرتے چلے جائیے۔ انہوں نے کہا کہ اب میں نے طے کیا ہے کہ اپنے بچہ کو امریکہ بھیج کر وہاں سٹل کراؤں۔

حبیب محمد صاحب کی یہ گفتگو سن کے مجھے ۳۵ سال پہلے کا ایک واقعہ یاد آیا۔ میرے بھائی عبدالعزیز خاں مرحوم جو یوپی میں ایک تجارتی ادارہ چلاتے تھے، وہ اپنے کسی کام کے لئے اسی قسم کی ایک سرکاری ونڈو پر گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ ونڈو کے پیچھے بیٹھے ہوئے کلرک نے کچھ رعونت دکھائی۔ اس پر میرے بھائی نے کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ یہاں کے گورنر ہیں۔ ونڈو کے پیچھے سے ایک متکبرانہ آواز آئی: اس میں کیا شک ہے، اس آفس میں تو میں ہی گورنر ہوں۔

یہ تھا وہ پر عذاب اور ترقی شکن نظام جو جواہر لال نہرو اور ان کے سوشلسٹ ساتھیوں نے اس ملک میں قائم کیا۔ نہرو کے ذہن میں نوجوانی کی عمر سے ایک سوشلسٹ خواب تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندستان کی حکومت پر قبضہ کر کے یہاں کی تمام چیزوں کو سرکاری کنٹرول میں لے لیں اور پھر حکومتی طاقت سے ایک نیا انڈیا بنائیں۔ اس خود ساختہ نئے انڈیا کی تعمیر کے لئے وہ اتنا زیادہ بے تاب تھے کہ اس کے قیام کا جلد موقع حاصل کرنے کے لئے انھوں نے ملک کی تقسیم کو منظور کر لیا۔ مگر آزادی کے بعد جب ان کا نام نہاد سوشلسٹ نظام قائم ہوا تو معلوم ہوا کہ وہ صرف ایک ایسا مصنوعی نظام تھا جو بے رحم شکنجہ بن کر خود ترقی کے عمل ہی کو روک دیا۔

۱۹۹۲ میں بابری مسجد کے ڈھائے جانے سے پہلے اس وقت کے وزیر اعظم نرسمہا راؤ نے مجھے بابری مسجد کے بارے میں بات چیت کے لئے بلایا تھا۔ پرائم منسٹر ہاؤس میں جب ان سے میری ملاقات ہوئی تو میں بے اختیار رو پڑا۔ میں نے کہا کہ بابری مسجد کو بچانے سے بھی بڑا مسئلہ ملک کو بچانا ہے۔ جواہر لال نہرو کے نام نہاد سوشلزم نے ملک کو تباہی کے آخری کنارے پر پہنچا دیا ہے۔ آپ اگر کچھ کر سکتے ہیں تو اس اقتصادی عذاب سے ملک کو نجات دیجئے۔ اس کے بعد لبرلائزیشن کا وہ واقعہ وجود میں آیا جس کو عام طور پر ڈاکٹر من موہن سنگھ کی طرف منسوب کیا جاتا

ہے جو اس وقت کی نرسمہار اؤ گورنمنٹ میں وزیر مالیات تھے۔

سوشلسٹ ماڈل کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ اس عالم اسباب میں قابل بقا (sustainable) نہ تھا۔ اسکے لئے ہندستان میں بھی اسی طرح ٹوٹنا مقدر تھا جس طرح وہ سوویت یونین میں ٹوٹ گیا۔ کسی ملک کی سب سے بڑی خوش قسمتی یہ ہے کہ اس کو ایسے دور اندیش لیڈر ملیں جو قوم کو ایسا نظام دے سکیں جو قابل بقا ہو۔ کسی بھی نظام کا پورا نتیجہ "نصف صدی" میں نکلتا ہے۔ اگر نصف صدی گزرنے کے بعد یہ معلوم ہو کہ چلایا جانے والا منصوبہ بے نتیجہ رہا تو نصف صدی کھو کر قوم کو اپنا سفر از سر نو پیچھے سے شروع کرنا پڑے گا۔

18

پاکستان کے قیام کے بعد وہاں جو نشانہ اختیار کیا گیا وہ بظاہر ایک صحیح نشانہ تھا، یعنی اسلامک پیٹرن آف سوسائٹی کا قیام مگر نتیجہ کا برعکس صورت میں نکلنا بتاتا ہے کہ اس نعرہ میں کوئی بنیادی غلطی تھی اس لئے اس معاملہ کا بے لاگ جائزہ ضروری ہے تاکہ اس نقصان کا کم سے کم وہ فائدہ ہو جس کو فارسی شاعر نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے: من نکردم شما حذر بکنید۔ تاکہ اس تجربہ سے اگر کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا تو کم از کم اس کے سبق سے بعد کے لوگ محروم نہ رہیں۔

جیسا کہ معلوم ہے، مولانا شبیر احمد عثمانی (وفات ۱۹۴۹) پاکستان کے سرگرم حامیوں میں سے تھے۔ پاکستان کے قیام کے بعد وہ کراچی چلے گئے۔ پاکستان میں جو دستور ساز اسمبلی بنائی گئی اس کے وہ ایک اہم رکن تھے۔ دستور ساز اسمبلی کے ممبر کی حیثیت سے انہوں نے داخلی طور پر اپنا پورا زور اس پر ڈال دیا کہ پاکستان کا دستور اسلامی اصولوں پر بنایا جائے۔ داخلی اعتبار سے مولانا شبیر احمد عثمانی کی کوشش اور خارجی اعتبار سے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور دوسرے علماء کی تقریری اور تحریری مہم کا یہ نتیجہ ہوا کہ ۱۹۴۸ میں دستور ساز اسمبلی نے قرارداد مقاصد (Obectives reso-lution) کو منظوری دے دی۔ اس قرارداد مقاصد کے الفاظ شریعت کی روشنی میں وضع کئے گئے تھے۔ اس کا استقبال مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے یہ کہہ کر کیا کہ پاکستان کی ریاست نے اب کلمہ پڑھ لیا ہے۔ حالانکہ زیادہ صحیح یہ تھا کہ وہ اعلان کرتے کہ ہم پاکستانیوں کے دلوں پر تو اسلام نہ

لکھ سکے البتہ ہم نے اسمبلی کے کے کاغذ پر اسلام کا نام تحریر کر دیا ہے۔

اس کے بعد نفاذ شریعت کے حصول کی مہم شروع ہوئی۔ اس مہم کے نتیجہ میں پاکستان دو طبقوں میں بٹ گیا۔ ایک حکمراں طبقہ اور دوسرا غیر حکمراں طبقہ۔ حکمراں طبقہ تقریباً سب کا سب سیکولر ذہن کا تھا۔ وہ سیکولر نظام بنانے کا حامی تھا۔ دوسری طرف غیر حکمراں طبقہ اسلامی شریعت کے نفاذ کا مطالبہ کر رہا تھا۔ اس کے نتیجہ میں دونوں طبقوں کے درمیان زبردست ٹکراؤ ہوا۔ وزیر اعظم لیاقت علی خان قتل کئے گئے۔ ذوالفقار علی بھٹو کو وزارت عظمیٰ سے ہٹا کر پھانسی دی گئی۔ جلسوں اور مظاہروں کے دوران بہت سے لوگ زخمی ہوئے یا مارے گئے۔ اس ہنگامہ خیز سیاست کے نتیجہ میں پاکستان میں اقتصادی ترقی کا عمل ٹھپ ہو کر رہ گیا۔

اسلام کے نام پر جو پر شور سیاست پاکستان میں چلائی گئی اس کا آخری نتیجہ یہ نکلا کہ پاکستان میں نہ سیکولر نظام قائم ہوا اور نہ اسلامی نظام۔ بلکہ ان دونوں کے سوا ایک تیسری چیز ظہور میں آئی، اور وہ تھی خانہ جنگی اور انارکی۔

کیوں ایسا ہوا کہ اسلام کے نام پر چلائی جانے والی مہم کا نتیجہ غیر اسلام کی صورت میں بر آمد ہوا۔ اس کا سادہ سا جواب یہ ہے کہ اسلامی نظام کے نام پر پاکستان میں جو پر شور تحریک چلائی گئی وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک جذباتی ہنگامہ تھا نہ کہ صحیح معنوں میں کوئی سوچی سمجھی تحریک۔ اور کوئی حقیقی نتیجہ ہمیشہ سوچی سمجھی تحریک کے ذریعہ نکلتا ہے نہ کہ جذباتی ہنگاموں سے۔

اکتوبر ۱۹۷۰ میں پاکستان میں عام انتخابات ہوئے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی قیادت میں جماعت اسلامی پاکستان نے بھی اس میں حصہ لیا۔

مولانا مودودی کا کہنا تھا کہ پاکستان اسلام کے نام الاٹ ہو چکا ہے (اور شاید اسلام خود ان لوگوں کے نام) جماعت اسلامی پاکستان نے نہایت زور و شور کے ساتھ الکشن میں حصہ لیا۔ الکشن کے خاتمہ کے بعد ۱۹۷۱ میں جب میں پاکستان گیا اس وقت میں نے دیکھا کہ اب بھی لاہور کی دیواروں پر ایسے پوسٹر موجود ہیں جن کے اوپر یہ الفاظ لکھے ہوئے ہیں: انشاءاللہ جیتے گی جماعت اسلامی جیتے گی۔

اس موقع پر جماعت اسلامی پاکستان نے ایک لمبا انتخابی منشور شائع کیا تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ پاکستان میں اقتدار حاصل کرنے کے بعد وہ لوگ کس طرح پاکستان کو اسلامائز کریں گے۔ اس مفصل منشور کا ایک جزٔیہ تھا: اتوار کے بجائے جمعہ کو تعطیل مقرر کی جائے گی (الجمعیۃ ویکلی، دہلی، ۶ مارچ ۱۹۷۰)

جماعت اسلامی پاکستان اس الکشن میں بری طرح ہار گئی۔ تاہم اس نے اور دوسرے پاکستانی علماء نے اتوار کے بجائے جمعہ کی چھٹی کی مانگ عوامی سطح پر بدستور جاری رکھی یہاں تک کہ پاکستان کے فوجی صدر جنرل محمد ضیاء الحق (وفات ۱۹۸۸) نے ایک صدارتی حکم کے ذریعہ اتوار کی چھٹی منسوخ کردی اور اس کے بجائے جمعہ کے دن کو سارے پاکستان میں سرکاری تعطیل کا دن قرار دے دیا۔

"اسلامی تعطیل" کا یہ تجربہ چند سال کے بعد سخت تنقیدوں کا شکار ہو گیا۔ خاص طور پر تاجر طبقہ اس کی کھلی مخالفت کرنے لگا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس "اسلامی تعطیل" کے نتیجہ میں پاکستان کو ہفتہ میں دو دن کا اقتصادی نقصان برداشت کرنا پڑتا تھا۔ پاکستان کے تجارتی ادارے جمعہ کو چھٹی کرتے تھے جب کہ ساری دنیا اس دن تجارتی سرگرمیوں میں مشغول ہوتی تھی۔ اس کے بعد پاکستان کے تجارتی ادارے اتوار کو اپنے دفاتر کھولتے تھے جب کہ ساری دنیا اس دن اپنے دفتروں کو بند کیے ہوئے ہوتی تھی۔ آخر کار ۱۹۹۷ میں نواز شریف کی حکومت نے ایک حکم کے ذریعہ جمعہ کی چھٹی منسوخ کردی اور اس کے بجائے اتوار کے دن کی چھٹی کو بحال کر دیا۔

اس عجیب وغریب صورت حال کا ایک معکوس نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے لوگ یہ سمجھنے لگے کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس میں وقت کا ساتھ دینے کی طاقت نہیں۔ حالانکہ "جمعہ کی چھٹی" کا اسلام سے کوئی تعلق ہی نہ تھا۔ یہ کچھ سیاسی ہنگامہ پسندوں کا ایک طبع زاد شوشہ تھا نہ کہ اسلام کا کوئی حکم۔

قرآن کی سورۃ ۶۲ اس معاملہ میں ایک واضح رہنمائی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سورہ میں جمعہ کے آداب بتاتے ہوئے کہا گیا ہے کہ: اے ایمان والو، جب جمعہ کے دن کی نماز کے لئے پکارا

جائے تو اللہ کی یاد کی طرف چل پڑو اور خرید و فروخت چھوڑ دو، یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانو۔ پھر جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو، اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو، تاکہ تم فلاح پاؤ۔ (۱۰۔۹)

اس آیت میں اسلامی زندگی کا جو نقشہ بتایا گیا ہے اس کے مطابق، جمعہ کا دن چھٹی کا دن نہیں ہے۔ یہ آیت تصدیق کرتی ہے کہ اہل ایمان جمعہ کی نماز کے مختصر وقفہ کو چھوڑ کر، جمعہ سے پہلے بھی اقتصادی سرگرمیوں میں مصروف ہوں گے۔ اور جمعہ کے بعد بھی دوبارہ اقتصادی عمل میں مصروف ہوں گے۔ اس آیت کے مطابق جمعہ کے دن کی تخصیص صرف یہ ہے کہ اس دن ظہر کی نماز کی جگہ جمعہ کی نماز پڑھی جائے گی۔ اس مختصر وقفہ کے علاوہ مسلمان جمعہ کے دن بھی اسی طرح مشغول رہیں گے جس طرح وہ عام دنوں میں مشغول رہتے ہیں۔

یہ ایک علامتی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نفاذ شریعت کے نام پر چلائی جانے والی مہم محض کچھ مذہبی لیڈروں کی جذباتی ہنگامہ آرائی تھی نہ کہ حقیقۃً اسلامی نفاذ کی کوشش۔ اور اس طرح کی غیر سنجیدہ کوشش کا انجام خدا کی اس دنیا میں وہی ہوگا جو عملاً پاکستان میں پیش آیا۔

("بقیہ نومبر کے شمارہ میں")

 ISLAMIC BOOKS 

Books by Maulana Wahiduddin Khan

Title	Price
Islam and Peace	Rs. 150.00
Principles of Islam	145.00
The Quran for All Humanity	75.00
Indian Muslims	65.00
Islam and Modern Challenges	95.00
Islam: The Voice of Human Nature	40.00
Islam: Creator of the Modern Age	55.00
Woman Between Islam and Western Society	145.00
Woman in Islamic Shari'ah	80.00
Islam As It Is	55.00
An Islamic Treasury of Virtues	195.00
Religion and Science	45.00
Man Know Thyself	8.00
Muhammad: The Ideal Character	8.00
Tabligh Movement	40.00
Polygamy and Islam	7.00
Hijab in Islam	20.00
Concerning Divorce	7.00
The Way to Find God	25.00
The Teachings of Islam	50.00
The Good Life	45.00
The Garden of Paradise	45.00
The Fire of Hell	45.00
Islam and the Modern Man	25.00
Uniform Civil Code	10.00
Muhammad: A Prophet for All Humanity	195.00
A Treasury of the Qur'an	75.00
Words of the Prophet Muhammad	75.00
Qur'an: An Abiding Wonder	125.00
The Call of the Qur'an	95.00
No End to Possibilities	145.00
Introducing Islam	195.00

Title	Price
The Qur'an Tr. T.B. Irving	Rs. 295.00
The Koran Tr. M.H. Shakir	195.00
Heart of the Koran by Lex Hixon	195.0
The Moral Values of the Quran by Harun Yahya	125.00
The Essential Arabic by Rafi'el-Imad Faynan	200.00
Presenting the Qur'an by Saniyasnain Khan	125.00
The Wonderful Universe of Allah by Saniyasnain Khan	85.00
The Soul of the Qur'an by Saniyasnain Khan	145.00
Tell Me About Hajj by Saniyasnain Khan	295.00
The Muslim Prayer Encyclopaedia Ruqaiyyah Waris Maqsood	325.00
After Death, Life! Ruqaiyyah Waris Maqsood	195.00
Living Islam: Ruqaiyyah Waris Maqsood	295.00
A Basic Dictionary of Islam Ruqaiyyah Waris Maqsood	295.00
The Muslim Marriage Guide Ruqaiyyah Waris Maqsood	250.00
The Beautiful Commands of Allah Ruqaiyyah Waris Maqsood	125.00
The Beautiful Promises of Allah Ruqaiyyah Waris Maqsood	175.00
Muslim Travel Guide (Forthcoming) Ruqaiyyah Waris Maqsood	
Muhammad: A Mercy to all the Nations by Q. A. Jairazbhoy	250.00
A-Z Steps to Leadership by Abdul Ghani Ahmed Barrie	95.00
The Sayings of Muhammad by Sir Abdullah Suhrwardy	75.00
The Life of the Prophet Muhammad by Mohd. Marmaduke Pickthall	75.00